اسلامی بنکاری

ایک تعارف



ڈاکٹر محمود احمد غازی

دار العلم والتحقیق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی بینکاری۔ایک تعارف

دار العلم والتحقیق

برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

مطبوعات: ۳

اسلامی بینکاری ۔ ایک تعارف

مؤلف

ڈاکٹر محمود احمد غازی

تدوین

سید عزیز الرحمٰن

نام کتاب:	اسلامی بینکاری ۔ ایک تعارف
مؤلف:	ڈاکٹر محمود احمد غازی
تدوین:	سید عزیز الرحمن
طبع اول:	مارچ ۲۰۱۰ء
تعداد:	ایک ہزار
کمپوزنگ:	سید قادر معین (بابر)
صفحات:	۱۱۲
قیمت:	۸۰ روپے

اہتمام

دار العلم والتحقیق برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی

www.rahet.org

ناشر

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی

فون: ۰۲۱۔۳۶۶۸۴۷۹۰

فہرست

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ O (البقرہ:۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں (قیامت کے روز) وہ اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر پاگل کر دیا ہو، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے۔ حال آں کہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے، پھر جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچ جائے اور وہ باز آجائے تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اسی کا ہو گیا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو کوئی پھر بھی سود لے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

Scanned by CamScanner

پیشِ گفتار

اسلامی بینکاری جدید معاشی موضوعات میں ایک تازہ اور زندہ موضوع ہے۔ جس پر عرصے سے گفت گو جاری ہے، اور اسلامی بینکاری کے حوالے سے خدشات، توقعات اور اس کے امکانات پر اہلِ علم مسلسل اپنی آرا کا اظہار کر رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب اردو میں بھی اس موضوع پر چند چیزیں دست یاب ہیں، اس طرح اردو خواں اور اردو داں طبقہ بھی ان ادق موضوعات کے بارے میں جان سکتا ہے اور اپنے علم میں اضافہ کر سکتا ہے۔

ہر نئے مسئلے کی طرح اسلامی بینکاری کے حوالے سے اس وقت مختلف آرا سامنے آ رہی ہیں، یہ ایک ناگزیر صحت مند رجحان ہے، جس سے مثبت انداز میں استفادہ جاری رہنا چاہیے، تاکہ زیرِ بحث موضوع کے تمام پہلو منقح ہو کر سامنے آ سکیں اور مستقبل قریب میں اس حوالے سے زیادہ واضح رائے کا اظہار ممکن ہو سکے۔ مگر موضوع جس قدر پیچیدہ اور سنجیدہ ہے، اسی قدر دقتِ نظر اور سنجیدگی کا ہم سے تقاضا کرتا ہے، اس بنا پر ضروری ہے کہ اس موضوع پر صرف وہ مستند اہلِ علم ہی اظہارِ خیال فرمائیں جو جدید معاشیات، بینکاری نظام اور اسلام کی اقتصادی تعلیمات پر مکمل عبور رکھتے ہوں۔ ان میں سے کسی ایک پہلو پر نظر رکھنے والے اہلِ علم بھی اپنے مقام پر مفید ثابت ہو سکتے ہیں، مگر ان کی انفرادی آرا کی بنیاد پر اجتماعی فیصلوں کا صدور مناسب نہیں ہوگا، بلکہ ان آرا کی روشنی میں ماہرینِ فن اور اہلِ علم کی مشاورت کے ذریعے ہی اس وسیع و دقیق موضوع کے تمام ممکنہ پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اس اہم موضوع پر ابتدائی تعارفی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک عام شخص بھی اس کے مطالعے کے بعد اسلامی بینکاری کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا ہے۔

کتاب کے مؤلف فاضل علام جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی فقہ اسلامی، قانون اور

معاشیات پر ماہر فن کا درجہ رکھتے ہیں، مزید یہ کہ پاکستان میں اسلامی بینکاری کے سفر کے بہت سے واقعات کے چشم دید گواہ بھی ہیں۔اس لئے ان کی تحریر کو خاص مقام، اعتبار و استناد حاصل ہے۔اس کتاب میں اسلامی بینکاری کے تینوں ممکنہ فریقوں

۱۔ سرمایہ دار، صنعت کار اور تاجر

۲۔ بینک اور

۳۔ حکومت کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے رویوں کا بے لاگ تجزیہ کیا گیا ہے۔جو اس موضوع پر پہلی کاوش ہے۔

کتاب کا سلیس اسلوب اور فاضل مؤلف کی دل سوزی و خیر خواہی اس کی تاثیر کو دو آتشہ کر رہی ہے۔اس کا مطالعہ نصابی ضرورتوں کی تکمیل کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی ایک طویل گفت گو پر مشتمل ہے، جو آپ نے دینی مدارس کے منتخب فضلا کے اجتماع سے چند برس قبل فرمائی تھی۔گفت گو کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے اور ضروری تدوین کے بعد ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی گئی کہ وہ اس پر نظر ثانی فرمائیں۔ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات اور پاکستان میں آپ کی عدم موجودگی کے سبب نظر ثانی میں خاصا وقت صرف ہوا۔ان مراحل سے گزر کر یہ گفت گو اب کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے، اس سے قبل یہ مضمون ماہ نامہ تعمیر افکار کی جنوری اور فروری ۲۰۱۰ء کی اشاعتوں میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔

ہم جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی کے شکریئے کے ساتھ دار العلم والتحقیق سے اس کی اشاعت کو اعزاز تصور کرتے ہیں، اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو پاکستان میں نفاذ اسلام کے سلسلے میں ایک مثبت اور موثر قدم کے طور پر قبول فرمائے اور فاضل مؤلف، ناشر اور اس میدان میں نیک نیتی سے سرگرم عمل ہر ایک کے لئے بابرکت فرمائے۔آمین

سید عزیز الرحمٰن

۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ/ ۳۰؍مارچ ۲۰۱۰ء

اسلامی بینکاری۔ایک تعارف

اسلامی بینکاری پر گفتگو بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی۔اس موضوع پر گفتگو بہت مختصر بھی ہوسکتی ہے اور بہت مفصل بھی۔یہ گفتگو آسان ہے اگر بینکاری سے وابستہ حضرات کے سامنے کی جائے۔اس لئے کہ وہ بینکاری سے متعلق تمام فنی سوالات ومشکلات سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں۔لیکن یہ گفتگو مشکل ہوجاتی ہے اگر کسی ایسے اجتماع میں کی جائے جو جدید کاروباری مشاغل سے دور اور بینکاری کے معاملات سے لاتعلق حضرات پر مشتمل ہو۔ثانی الذکر نوعیت کے اجتماع میں بہت اختصار سے کام لینا مشکل ہے۔اس لئے میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

تفہیم کی سہولت کی خاطر میں اپنی گفتگو کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پہلا حصہ اسلامی بینکاری کے بارے میں چند نظری مسائل پر مشتمل ہوگا۔ان مسائلمیں اسلامی بینکاری کا تعارف اور اسلامی بینکاری کو درپیش اہم فقہی، قانونی، انتظامی اور تدبیری مسائل کا مفصل تذکرہ ہوگا۔جس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جس چیز کو ہم اسلامی بینکاری کہتے ہیں اس سے ہماری کیا مراد ہے اور اس ہدف کے حصول میں ہمیں کن کن مراحل اور کن کن مدارج سے گزرنا ہے۔گفتگو کے اس حصے میں کسی حد تک ان مشکلات کا تذکرہ بھی ہوگا جو اسلامی بینکاری کے راستے میں ہمیں درپیش ہیں۔یہ مشکلات نہ صرف ہمیں درپیش ہیں، بلکہ دنیائے اسلام میں ہر جگہ جہاں جہاں اسلامی بینکاری پر کام ہورہا ہے، وہاں یہ مشکلات اور رکاوٹیں پیش آرہی ہیں۔ان مشکلات کو حل کرنے کی جو جو تدابیر سوچی گئی ہیں۔یا سوچی جارہی ہیں ان میں سے بھی کچھ کا تذکرہ میں آپ کے سامنے کروں گا۔

گفتگو کے دوسرے حصے میں پاکستان میں اسلامی بنکاری کا آغاز اور اب تک ہونے والی پیش رفت اور بعض مشکلات ومسائل کے بارے میں جو کچھ میری معلومات یا مشاہدے

میں آیا ہے وہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اسلامی بینکاری کیا ہے؟

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلامی بینکاری کیا ہے؟ اسلامی بینکاری سے عام طور پر کیا سمجھا جاتا ہے؟ اور اسلامی بینکاری سے ہمیں کیا مراد لینی چاہئے؟ رائج الوقت اسلامی بینکاری اور ایک مثالی آئیڈیل اسلامی بینکاری میں کیا فرق ہے؟ اور ہمیں اس عارضی مرحلے کو، یا رائج الوقت اسلامی بینکاری کو ایک مثالی اور آئیڈیل بینکاری میں تبدیل کرنے کے لئے کیا کیا کرنا چاہئے۔

یہ بات تو ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ جس ادارے کو ہم بینک کہتے ہیں یہ ایک خالصتاً مغربی ادارہ ہے، مغربی دنیا ہی میں پروان چڑھا ہے اور معاشیات کے جس تصور پر مبنی ہے وہ بھی خالصتاً ایک مغربی تصور ہے اور مغربی اصطلاحات ہی میں اس تصور کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بات پہلے ہی مرحلے میں واضح طور پر جان لینی چاہئے کہ بینک اپنی اصل، آغاز اور روح کے اعتبار سے ایک مغربی ادارہ ہے۔

اسلامی تاریخ میں نہ اس نام کا کوئی ادارہ تھا، نہ یہ لفظ مسلمانوں کے لئے مانوس تھا، اور نہ ان مقاصد کے لئے جو بینکاری کے ذریعے حاصل کئے جاتے ہیں، کوئی جداگانہ ادارہ اسلامی دور میں موجود تھا۔ اس لئے قدیم عربی زبان میں بنک کا مترادف کوئی لفظ بھی موجود نہیں ہے۔ اس لئے اس مغربی تصور یا ادارے کے لئے عربی زبان میں جو اصطلاح معاصر اہلِ علم نے استعمال کی ہے وہ مصرِف کی اصطلاح ہے، جو اسلامی اصطلاح صرف یا بیع صرف سے ماخوذ ہے۔ جس میں زر کی لین دین کی جاتی ہے۔

گویا مصرف کے جدید عربی لفظ کے معنی اس جگہ کے ہیں جہاں زر کا لین دین کیا جاتا ہو۔ سونے چاندی کا کاروبار کیا جاتا ہو۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مصرف لفظ تو بڑا خوب صورت ہے۔ ایک اسلامی عربی اصطلاح سے ماخوذ ہے، لیکن یہ بینک کا صحیح متبادل نہیں ہے۔ اس لئے کہ جس ادارے کو مغربی اصطلاح میں بینک کہتے ہیں یہ وہ ادارہ ہے جو قرضوں کا لین دین کرتا ہے اور قرضوں ہی کا کاروبار کرتا ہے۔ مؤسسۃ تتعامل فی الدیون والائتمان آج کل کے

عرب مصنفین نے، ماہرینِ معاشیات نے بینک کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ ادارہ جو قرضوں کا کاروبار کرتا ہو، قرضوں کا لین دین کرتا ہو، وہ بینک کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصرف کے لغوی معنی میں یہ بات شامل نہیں ہے۔

بینکوں کا آغاز دنیائے مغرب میں کیسے ہوا۔ آپ حضرات غالباً اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ بینکنگ کا آغاز کسی طے شدہ پروگرام یا اسکیم یا منصوبے کے تحت نہیں ہوا۔ بلکہ اتفاقاً حالات اس رخ پر چل پڑے کہ زر اور قرضوں کے کاروبار نے آگے چل کر بالتدریج ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ادارہ بینک کے نام سے موسوم قرار پایا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ مغربی دنیا میں بینکوں کا یہ کاروبار پہلے پہل بعض سناروں نے دھوکے سے خفیہ طور پر شروع کیا تھا۔ وہ بڑے بڑے سنار جو لوگوں کے لئے سونے کے زیورات بنایا کرتے تھے، ان کے پاس سونے کے ذخائر کی حفاظت کا باقاعدہ اور مؤثر انتظام بھی ہوتا تھا۔ اس لئے بہت سے لوگ حفاظت کے لئے اپنے زیورات ان کے پاس رکھنے لگے، اس لئے کہ عام لوگوں کے اپنے پاس طلائی اور نقرئی زیورات اور نقد رقوم جیسی قیمتی اشیا کی حفاظت کا کوئی مؤثر انتظام نہیں ہوتا تھا۔

پرانے زمانے میں کاغذی کرنسی نہیں ہوتی تھی اور زر و جواہر جمع کرنے والوں کو اپنے پاس سونے اور چاندی کے سکوں یا زیوروں کی شکل میں دولت جمع کرنا پڑتی تھی، جو جگہ کی متقاضی بھی تھی، اور حفاظت کے لئے خصوصی انتظامات کی متقاضی بھی تھی۔ یہ سہولتیں ہر شخص کو دست یاب نہیں تھیں۔ پھر ہر شخص کے ہاں چوری کا خطرہ بھی رہتا تھا۔ اس لئے بعض بڑے بڑے سناروں نے اس کا انتظام بھی کیا کہ اگر کچھ لوگ اپنا سونا یا چاندی ان کے پاس رکھوانا چاہیں تو وہ حفاظت کے لئے اپنے زیورات اور اپنا سونا وہاں رکھوا سکتے ہیں۔ اس طرح یہ رواج عام ہو گیا کہ بڑے بڑے سنار لوگوں کا سونا اپنے پاس رکھا کرتے تھے اور اس کی حفاظت کا بندوبست بھی کیا کرتے تھے۔

پھر جب اس طرح سونا بڑی مقدار اور مالیت میں سناروں کے پاس جمع ہونے لگا تو انہوں نے اس سونے کی بنیاد پر رسیدیں یا ہنڈیاں جاری کرنا شروع کیں کہ اس رسید کے حامل شخص کا اتنا سونا ہمارے پاس جمع ہے۔ چوں کہ لوگوں کو معلوم تھا کہ فلاں سنار کے پاس لوگوں کا

سونا جمع ہوتا ہے اس لئے بڑے بڑے سناروں کی جاری کردہ ہنڈیوں پر کاروباری لوگوں کا اعتماد قائم ہوگیا۔اب اگر فرض کریں کہ کسی کو دس تولہ سونا ادا کرنا ہے۔تو وہ دس تولہ سونا نقد اوردست دردست دینے کے بجائے دس تولے سونے کی رسید دے دیا کرتا تھا۔اس رسید کو لینے والا بھی قبول کرلیا کرتا تھا۔اس لئے لوگوں کو یقین تھا کہ جس سنار کی جاری کردہ رسید دی گئی ہے وہ قابل اعتماد ہے اوراس کے پاس اِس شخص کا واقعی اتنا سونا جمع ہے۔لہٰذا اس کی بنیاد پر جو ہنڈی جاری کی گئی ہے وہ حقیقی ہنڈی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کاغذی ہنڈیاں ہی اصل سونے کی جگہ کاروبار میں استعمال ہونے لگیں۔ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ لوگ اپنا اصل سونا سنار سے واپس لے کر پھر اپنے قرض داریا مقروض کو دیتے ہوں،ان ہنڈیوں کی بنیاد پر ہی کاروبار پر اکتفا کیا جانے لگا۔

کچھ عرصے کے بعد جب سناروں کو یہ اندازہ ہوا کہ ان ہنڈیوں کی بازار میں بڑی قیمت مانی جانے لگی ہے تو انہوں نے اپنے طور پر بھی ہنڈیاں جاری کرنی شروع کردیں۔مثلاً اگران کے پاس دس تولہ سونا تھا تو دس تولے سونے کے مقابلے میں بیس تولہ سونے کی رسیدیں جاری کرنے لگے۔اس لئے کہ ان کو تجربے نے بتایا کہ کوئی شخص اپنا اصل سونا واپس لینے یا وصول کرنے نہیں آتا۔بلکہ سونے کے لین دین کا بیشتر کاروبار ہنڈیوں ہی کی بنیاد پر ہی چلتا ہے۔اس ہنڈی کے کاروبار سے ان سناروں کو بے پناہ فائدہ ہوا۔اب صورت یہ ہوگئی کہ اصل سونا جو محفوظ ہے وہ تو مثلاً دس تولہ کا ہے۔لیکن اس دس تولہ سونے کے نام پر کاروبار میں جو کاغذات چل رہے ہیں،وہ بیس تولے کے چل رہے ہیں یہ سلسلہ مزید بڑھا،سناروں نے بیس تولے سے بڑھا کر چالیس تولے کا کاروبار شروع کردیا،پھر چالیس سے بڑھ کر مثلاً سو ہوگیا۔اس طرح کاغذوں میں کاروبار اور قرضوں کا حجم بڑھتا گیا۔آج صورت حال یہ ہے کہ اگر کسی بینک میں کھاتہ داروں کا مثلاً ایک لاکھ روپیہ جمع ہے۔تو اس بینک کے بلا مبالغہ پچاس لاکھ یا ایک کروڑ کاروبار میں لگے ہوتے ہیں۔

یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے بینکوں کی شکل اختیار کرگیا۔اور بینکوں نے ایک باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کرلی۔اب بینک سے مراد ہے وہ ادارہ جو قرضوں کا کاروبار کرتا ہو،اور قرضوں کا لین دین کرتا ہو۔یہ بینکاری کے نظام کا آغاز تھا۔جیسے جیسے مغربی دنیا کی معاشیات ترقی

کرتی گئی بینکوں کا ادارہ بھی ترقی کرتا گیا۔اور یہ بات ہم میں سے ہر ایک کے علم میں ہے کہ مغربی دنیا کے بڑے بڑے ممالک ایک طویل عرصے دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں پر استعماری قوتوں کے طور پر قابض رہے ہیں۔دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علاقوں اور وہاں کے سائل کو انہوں نے اپنے تصرف میں لاکر خوب خوب استعمال کیا،اور وہاں سے حاصل کی ہوئی دولت کو اپنی تجارت اور صنعت میں لگایا۔اور اس طرح بین الاقوامی تجارت کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل دے دی۔

یہ ایک ایسی بین الاقوامی تجارت تھی جس کا مقصد ایک خاص نسل کی پرورش اور خدمت تھا،انسانیت کی خدمت نہ تھا۔چناں چہ انگریزوں نے ہندوستان سے،فرانسیسیوں نے شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ سے،ولندیزیوں نے مشرق بعید سے دولت جمع کر کے اپنے اپنے ملکوں میں بھیجنی شروع کی اور اپنے اپنے ملکوں کی معیشت کو انتہائی مضبوط اور بہتر بنیادوں پر قائم کرلیا۔دنیائے اسلام تیزی سے فقروفاقے اور معاشی پس ماندگی کا شکار ہوتی گئی اور مغرب کے استعماری ممالک اسی رفتار سے ترقی کرتے گئے۔

چوں کہ اس تجارت کا اصل مقصد دنیائے اسلام کے وسائل کو مغرب میں منتقل کرنا تھا اس لئے اس پورے نظام کی اٹھان اور اس پورے نظام کی ساخت یہ تھی اور ہے کہ کم زور اور بے اثر افراد و اقوام کے سرمائے کو کھینچ کر طاقت ور اور بااثر قوموں تک منتقل کیا جائے۔یہ اس پورے بینکاری نظام کی روح اور اسپرٹ ہے۔۱۹۹۱ء یا ۱۹۹۲ء کے اعداد وشمار کے مطابق کیا صورت حال تھی وہ بہ طور مثال عرض کرتا ہوں تازہ ترین اعداد وشمار اس وقت مجھے دست یاب اور مستحضر نہیں ہیں۔وہ ان اعداد وشمار سے یقیناً خاصے مختلف،منفی اور زیادہ ہول ناک ہوں گے۔

سن ۱۹۹۱ء،۱۹۹۲ء کے اعداد وشمار یہ تھے کہ پورے روئے زمین پر جو دولت اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے جو وسائل روئے زمین پر پائے جاتے ہیں۔ان کا ۸۱ فیصد دنیا کی ۱۹ فیصد آبادی کے کنٹرول میں تھا۔اور دنیا کی ۸۱ فیصد آبادی بقیہ ۱۹ فیصد وسائل کے اندر رہ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔اور وہ ۱۹ فیصد وسائل بھی تیزی کے ساتھ دنیائے مغرب میں منتقل ہورہے ہیں اور پورے تسلسل کے ساتھ ہورہے ہیں،بینکاری کا عالمی نظام یہی کام کرتا ہے۔اس کی ساخت اور اٹھان ہی ایسی ہے کہ وہ وسائل اور دولت کو مرتکز کر کے بڑے بڑے بینکوں کو

منتقل کرتا رہتا ہے۔ یہ بڑے بڑے بینک جو پوری دنیا کی مالیات و معیشت کو کنٹرول کرتے ہیں مغرب کے بااثر لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ بینکاری نظام کی بنیاد اور اساس یہی ہے جس کی طرف بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔

آپ پاکستان کی مثال لیں۔ پاکستان ایک زمانے میں خاصی معاشی پریشانی سے گزرا ہے۔۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء سے لے کر ۱۹۹۹ء تک ایک زمانہ ایسا تھا جب پاکستان کے پاس غیر ملکی زرمبادلہ کے وسائل اتنے محدود تھے کہ ہفتے دو ہفتے سے زیادہ کی تجارت کی ادائیگیوں کے لئے کافی نہیں تھے۔

غیر ملکی ادائیگی کی ملکی معاشیات میں بہت بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ جب بیرون ملک سے سامان آتا ہے تو اس کی ادائیگی غیر ملکی کرنسی کی صورت میں کرنی پڑتی ہے۔اس لئے ہر ملک کو بیرونی زرمبادلہ کے ذخائر دنیا کی مضبوط کرنسیوں اور ضمانتوں کی شکل میں رکھنے پڑتے ہیں۔ وہ غیر ملکی کرنسی جو پاکستان کے پاس ۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۹ء کے سالوں میں دست یاب تھی، وہ صرف دو ہفتے کی ادائیگی کے لئے کافی تھی۔ آتی رہتی تھی، چلی جاتی تھی۔ ایک وقت میں دو ہفتے سے زیادہ کی ادائیگی کا بندوبست نہیں ہوتا تھا۔ ملک کے پاس زرمبادلہ کی مد میں چھ سو سات سوملین، یا ساٹھ ستر کروڑ ڈالرز سے زیادہ کا سرمایہ نہیں تھا بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آ گیا تھا کہ حکومت پاکستان کے پاس چند ملین ڈالر سے زیادہ کا زرمبادلہ نہیں تھا۔ آج (۲۰۰۴ء میں) کہتے ہیں کہ الحمدللہ پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر کوئی دس مہینے کی ادائیگی کے لئے کافی ہو گئے ہیں اور چودہ بلین یا چودہ ارب ڈالرز تک ان کی مقدار پہنچ گئی ہے۔اس پر اربابِ حکومت آئے دن بہت خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ کارپردازان ریاست آئے دن مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یقیناً یہ اطمینان کی بات ہے اور ہمیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ لیکن یہ تکلیف دہ حقیقت نہیں بھولنی چاہئے کہ یہ بارہ، چودہ یا پندرہ ارب ڈالرز جو زرمبادلہ کی شکل میں حکومت پاکستان کے پاس بتائے جاتے ہیں یہ پاکستان کے اندر کہیں نہیں ہیں۔ یہ مغربی دنیا کے بینکوں میں ہی جمع ہیں۔ یہ بینک آف امریکہ میں ہیں، یہ بینک آف انگلینڈ میں ہیں، اور دنیا کے بڑے بڑے یہودی بینکوں کے پاس جمع ہیں۔ اگر وہ بہ یک جنبشِ قلم ان حسابات کو منجمد یا منسوخ کردیں یا اس رقم کو ضبط کرلیں یا فریز کردیں تو حکومت پاکستان

صرف شور مچانے اور واویلا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتی اور یہاں جلوس نکالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ صورت حال سرمائے کی منتقلی کے اس پورے نظام کا ایک لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جو عالمی بینکاری کی بنیاد ہے۔ یہ وہ سرمایہ ہے جو حکومت پاکستان نے یا پاکستان کے لوگوں نے اپنی قربانیوں سے بچایا ہے یا محفوظ کیا ہے۔ صرف اس لئے کہ ہمارے زرمبادلہ کا نظام چلتا رہے۔ بین الاقوامی تجارت چلتی رہے، ہماری خون پسینے کی کمائی سے حاصل ہونے والا یہ سارا سرمایہ بھی مغربی ملکوں میں ہے۔ یہی صورت حال چھوٹی سطح پر بھی پائی جاتی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ عام افراد سے ان کی بچتیں حاصل کی جاتی ہیں۔ یہاں فرض کیجئے کہ پانچ سو آدمی جمع ہیں۔ ان پانچ سو آدمیوں میں سے ہر ایک کی چھوٹی چھوٹی بچتیں ہیں۔ کسی کی ایک ہزار کی، کسی کی دو ہزار کی ہے، پانچ ہزار کی ہے۔ یہ ساری رقم بینکوں میں جمع ہے۔ مثلاً دس بینکوں میں جمع ہے۔ ان دس بینکوں کے سرمائے کا ایک بڑا حصہ ایک بڑے بینک میں جمع ہے۔ پھر چند بڑے بڑے بینکوں کا سرمایہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں جمع ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا سرمایہ بینک آف انگلینڈ اور بینک آف امریکہ میں جمع ہے۔ اس لئے ہماری اور آپ کی جتنی بھی سیونگ یا بچت ہے وہ بالآخر دنیا کے چند بڑے بینکوں کے کنٹرول میں چلی جاتی ہے۔ چند بڑے سرمایہ داروں کی گرفت میں اس سرمائے کی لگامیں رہتی ہیں۔ وہ جس طرح چاہیں سرمائے کے اس گھوڑے کو یا سرمائے کی اس ٹرین کو چلا سکتے ہیں۔

یہ بینکنگ کے نظام کا ایک بنیادی خاصہ ہے۔ اور اس نظام کی ساری اٹھان پچھلے تین چار سو سال میں اسی بنیاد پر ہوئی ہے کہ مشرق اور جنوب کے ممالک کے، دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک اور کمزور اقوام سے سرمائے کو کھینچا جائے۔ ان کی دولت کو ہر تدبیر سے چوسا جائے۔ اور چوس چوس کر اس کو دولت کے ایک بہت بڑے تالاب میں ڈالا جائے۔ دولت کا وہ بڑا تالاب بھی آزاد اور خود مختار نہ ہونے پائے، بلکہ اس میں نالیاں بنا کر ایک زیادہ بڑے تالاب میں پہنچائی جائیں۔ اس بڑے تالاب سے ایک ایسے مرکزی تالاب میں پہنچائی جائیں، جس کی چابیاں اور کنجیاں ہمارے یا آپ کے ہاتھ میں نہیں ہیں، کسی اور کے ہاتھ میں ہیں۔

یہی بینکاری کا وہ نظام ہے جس پر دنیا کا معاشی نظام چل رہا ہے۔ یہ معاشی نظام سود،

بینکاری اور آزاد منڈی کی معیشت کی سہ گانہ بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ بنیادیں مغربی دنیا کے لئے اصول ایمان کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں مغربی دنیا کسی نرمی، مصالحت یا مداہنت کے لئے تیار نہیں ہے، اس نظام کے تحفظ کی خاطر وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔

اس وقت مغربی دنیا کے لئے جو بات سب سے زیادہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے، جو گویا اب ان کا دین وایمان بن گئی ہے وہ دو چیزوں کا تحفظ ہے: سیکولر ڈیموکریسی، یعنی لامذہبیت پر مبنی اور دین ودنیا کی تفریق وتقسیم کے تصور پر استوار جمہوری نظام اور آزاد منڈی کی معیشت پر کاربند سودی نظام، اس وقت ان دونوں امور کا ہر قیمت پر تحفظ کرنا مغربی دنیا اپنے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتی ہے۔ آج ان کا دین ان ہی اصول دوگانہ پر مبنی ہے۔ آج مغرب کی بالادستی اور قوت کا دارومدار اس کی وسیع وعریض ہے، عسکری قوت پر اتنا نہیں ہے جتنا اس کی معاشی قوت پر ہے۔ اس معاشی قوت کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے بڑے بڑے وسائل دو ہیں۔ ایک تو بینکاری اور مالیات کا یہ عالمی نظام جس نے پوری دنیا کو ایک مضبوط نظام میں جکڑ رکھا ہے۔ دوسرے وہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں (ملٹی نیشنلز) جن کی حیثیت اب روز بہ روز وہی ہوتی جارہی ہے جو آج سے اڑھائی سو سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔

مزید رہی سہی کسر اب گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کے نام سے آنے والی نئی پالیسیوں اور منصوبوں نے پوری کردی ہے۔ تجارت کے بین الاقوامی معاہدوں اور معیار بندی کے عالمی منصوبوں کے ذریعے مشرقی ممالک کی رہی سہی آزادی کو بھی ختم کردینے کے اقدامات تیزی سے کئے جارہے ہیں۔ ان حالات میں دنیائے اسلام کے سامنے امکانات روز محدود سے محدود تر ہوتے چلے جارہے ہیں، اور فرصت تحمل کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے۔ جب تک اس نظام سے مکمل چھٹکارا حاصل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک دنیائے اسلام کی مکمل آزادی اور اس کی تہذیب کے نمود واظہار کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

یہاں یہ بات واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم اس نظام سے مکمل نجات حاصل کرنے کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ اس نظام کو ختم کرنے یا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ دنیائے اسلام اپنے سے باہر کی ہر چیز کو تباہ وبرباد کردے، یا مغرب کے رائج الوقت نظام کی بساط پلٹ دینے کو اپنا ہدف اور مقصود قرار دے

دے، بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ دنیائے اسلام اپنی معاشی آزادی کو یقینی بنائے، اپنے وسائل کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لائے۔ اپنے تہذیبی اور تمدنی مستقبل کی نقشہ کشی خود اپنی روایات اور آرزوؤں کے مطابق کرے، مغرب یا مشرق جس سے بھی معاملہ کرنا ہو برابری کی سطح پر باوقار انداز میں کرے۔ دنیائے اسلام کے آزاد اور خودمختار مسلم ممالک کے درمیان آپس میں لین دین اور معاشی تعاون میں اضافہ ہو۔ بین الاقوامی تجارتی اور غیر تجارتی روابط کے لئے دنیائے اسلام اپنا ایک الگ نظام وضع کرے، جس میں وہ دوسروں کے فیصلوں کی تابع مہمل نہ ہو۔ مغربی عالمگیریت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسلامی عالمگیریت کے اصولوں کو روبہ عمل لایا جائے۔

اس کام کے لئے سب سے پہلی شرط مسلم ممالک میں اسلامی معیشت کا نفاذ ہے۔ اسلامی بنیادوں پر ملکی معیشت، مالیات اور تجارت کی تشکیل نو کا یہ کام بہت طویل کوشش، قوت فیصلہ، اجتماعی مساعی اور قربانیوں کا متقاضی ہے۔ یہاں پہلے قدم کے طور پر فکری آزادی درکار ہے، مغرب کی جا و بے جا نقالی سے نجات یہاں ناگزیر ہے۔ غلامانہ پیروی اور عقیدت مندانہ نقالی اور چیز ہے اور آزادانہ استفادہ بالکل مختلف چیز ہے۔

اسلامی معیشت کی طرف پیش قدمی کے لیے ضروری ہے کہ مسلم ممالک میں مسلم ماہرین معیشت دست یاب ہوں، مسلم ماہرین بینکاری موجود ہوں، مسلم مالیاتی ماہرین ضروری تعداد اور مطلوبہ صلاحیتوں کے ساتھ فراہم ہو رہے ہوں۔ یہ کام نظام تعلیم کی تشکیل نو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ایک طویل المیعاد عمل ہے۔ لیکن اس عمل کی تکمیل کے انتظار میں موجودہ صورت حال کو جوں کا توں جاری بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لئے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نظام سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، یہ بہت مشکل کام ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ ممکن ہے یہ قربانیاں ان قربانیوں سے بہت بڑی اور زیادہ ہوں جو بیسویں صدی میں سیاسی آزادی کے لئے دی گئی تھیں۔ متنبی کا مصرع استعمال کرتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے بہت سے ہفت خواں طے کرنے پڑیں گے، کہ اس راستے

میں بڑے بڑے پہاڑ ہیں، ریگستان ہیں، تلواریں ہیں اور گردنیں مارنے والے ہیں اور گردنیں مارنے کا کام ہے۔ یہ سب کچھ اس تبدیلی کے راستے میں برداشت کرنا پڑے گا۔ مسائل ومشکلات کے اس سمندر سے گزر کر جانا ہی پڑے گا۔ یہ ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

اس معاملے میں جنہوں نے چار سو برس کی طویل مدت اور ہزاروں تجربات سے گزرنے کے بعد یہ نظام بنایا ہے وہ آپ کو آسانی سے اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ آپ جب چاہیں اس نظام سے چھٹکارا حاصل کر کے آزاد ہو جائیں اور ان کے لئے دولت فراواں کے اس راستے کو بند کر دیں۔ ان نالیوں کو بند کر دیں جن نالیوں سے آپ کا سرمایہ ان کے ہاں جا رہا ہے۔ موضوع سے براہِ راست متعلق بات تو نہیں ہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی بات یاد آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں جس سے مسلمانوں کے مزاج اور رویے کا اندازہ ہو گا۔

مملکت سعودی عرب، کویت، ایران اور عراق ان چار ملکوں کے پاس جو دولت کے انبار ہیں وہ سب تیل کے وسائل کا نتیجہ ہیں۔ یہ چار ممالک دنیا کے ستر فی صد سے بھی زیادہ تیل کے مالک ہیں۔ پوری دنیا کا ستر فیصد سے زائد تیل ان علاقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ چوں کہ تیل کا ابھی تک کوئی سستا متبادل تلاش نہیں کیا جا سکا۔ اس لئے دنیا کی ساری ترقی، انڈسٹری، معیشت، صنعت ہر چیز کی کامیابی بلکہ بقا کا دارومدار یہاں کے تیل پر ہے۔ جب تک یہاں سے تیل آسانی سے اور سستا ملتا رہے گا اس وقت تک وہاں انڈسٹری بھی چلے گی، تجارت بھی چلے گی، بجلی کے قمقمے بھی روشن رہیں گے۔ ساری گہما گہمی اور سرگرمی جاری رہے گی۔ جوں ہی یہاں سے تیل کی پیداوار میں یا تیل کی ترسیل میں کوئی تعطل واقع ہو گا تو ان کی پوری معاشی زندگی ایک لمحے میں معطل ہو جائے گی۔ گویا مغرب کی معاشی زندگی کے لئے جو خون درکار ہے وہ بیشتر دنیائے اسلام ہی سے فراہم ہوتا ہے۔ جب تک یہ خون مغربی معیشت کے جسم کو فراہم ہوتا رہے گا اس وقت تک مغرب کی معاشی، صنعتی اور تجارتی سرگرمیاں جاری رہیں گی۔ اور جس لمحہ یہ فراہمی بند ہو گی اس لمحے سے معاشی صحت اور صنعتی زندگی متاثر ہونا شروع ہو جائے گی۔

یہ کویت پر عراق کا حملہ، یہ فوراً امریکی افواج کا بن بلائے خلیج میں آموجود ہونا اور آج تک موجود رہنا، پھر بالآخر عراق کی تباہی اور بربادی اور وہاں امریکی فوجوں کا غاصبانہ قبضہ۔

یہ سب واقعات اسی کاوش کا ایک حصہ ہیں جو ۱۹۷۳ء بلکہ اس سے بھی پہلے سے جاری ہے۔

عرب اور خلیجی تیل اور گیس کی یہ اہمیت اہل مغرب کو بالعموم اور ان علاقوں پر قابض استعماری قوت (برطانیہ) کو بہت پہلے سے معلوم تھی۔انہوں نے اس علاقے پر اپنے طویل قبضے کے دوران یہاں کے قدرتی وسائل کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں۔اس علاقے کے سیاسی جغرافئیے کی تشکیل میں ان حاصل شدہ معلومات کا کردار بہت اہم اور بنیادی تھا۔خلیج کے بارے میں اہل مغرب کی پالیسیوں میں یہاں کے قدرتی وسائل پر کنٹرول اور تحکم کو خاص مقام حاصل تھا۔

جب ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران شاہ فیصل مرحوم نے تیل کا ہتھیار استعمال کیا تھا تو اس سے مسئلہ فلسطین کے حل میں تو کوئی مدد نہ ملی،لیکن خلیجی سیاست کے بارے میں اہل مغرب کا انداز بالکل بدل گیا۔اس وقت سے انہوں نے متبادل راستوں اور امکانات کے بارے میں نہ صرف غور و خوض شروع کر دیا، بلکہ متبادل پالیسیوں پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا۔جو کچھ ۱۹۷۳ء سے آج تک ہوا ہے، واضح طور پر نظر آتا ہے کہ وہ سارے کا سارا ان ہی تیاریوں اور تدابیر کا ایک حصہ ہے۔

یہ جو بے پناہ اور بے حساب دولت ان ملکوں کے پاس ہے وہ کتنی ہے؟ اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے۔صرف سعودی عرب کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔جس سے اندازہ ہوگا کہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔۱۹۸۴ء میں کینیڈا کی ایک خاتون نے جو اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس کی پروفیسر تھی۔سعودی عرب میں کچھ عرصے قیام کیا۔وہ سن ۱۹۸۱ سے لے کر ۱۹۸۴ تک وہاں رہی۔اس نے اپنے آپ کو ایک صحافی کی بیوی کے طور پر وہاں متعارف کرایا اور یہ ظاہر کیا کہ اس کو عربوں اور مسلمانوں کے معاشرت سے، رہن سہن اور ثقافت سے اور خاندانی معاملات سے دل چسپی ہے۔یوں اس کو وہ سہولتیں حاصل ہوگئیں جو عام مغربی لوگوں کو مغرب میں حاصل نہیں ہوتیں۔اس طرح اس نے بااثر سعودیوں کے گھروں میں آنا جانا شروع کر دیا اور بہت سی معلومات سعودیوں کے بارے میں جمع کیں۔

ان معلومات کی بنیاد پر اس نے ۱۹۸۴ء میں ایک کتاب لکھی The Saudis دی سعودیز۔ جو بہت تقسیم ہوئی۔ اس زمانے کی مقبول ترین کتابوں میں سے تھی۔ ۱۹۸۶ء

۱۹۸۹ء کے سالوں میں اس کے بیسیوں ایڈیشن نکلے اور لاکھوں نسخے دنیا بھر میں پڑھے گئے۔ اس کتاب کا ایک باب سعودی عرب کی معاشیات اور آمدنی کے بارے میں تھا۔ اس باب کا ایک اہم بیان میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ جس کے بعد میں اپنی اس گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ سعودی عرب کی کل اور مجموعی آمدنی کتنی ہے۔ اس کا سعودیوں میں سے بھی کسی کو اندازہ نہیں کہ وہ کتنی آمدنی ہے۔ کسی کو بھی حتمی اور قطعی طور پر یہ معلوم نہیں کہ ان کے ملک کی آمدنی دراصل کتنی ہے۔ باہر کی دنیا بھی کو نہیں معلوم، اور ان کو بھی نہیں معلوم۔ بڑی انٹیلی جنس ایجنسیز کو مثلاً سی آئی اے وغیرہ کو علم ہو تو ہو، عام لوگوں کو علم نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کر لیں کہ اس خاتون کے بیان کے مطابق سعودی عرب کی کل آمدنی کا پندرہ فیصد حصہ شاہی خاندان کو بہ طور رائلٹی کے دیا جاتا ہے۔ یعنی ملک کی مجموعی آمدنی کا پندرہ فیصد۔ شاہی خاندان سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو شاہ عبدالعزیز کے دادا کی اولاد میں ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کے دادا کا نام ترکی تھا۔ ان کی اولاد میں، جن میں شاہ عبدالعزیز کے چچا اور چچاؤں کی اولادیں اور دادا اور ان کی بھائی کی اولادیں بھی شامل ہیں۔ ان سب کی تعداد اُس وقت (یعنی اسی کی دہائی کے اوائل میں) ساڑھے تین ہزار تھی۔ اور اصول یہ تھا کہ سب سے زیادہ رائلٹی خود بادشاہ کو ملے گی۔ اس وقت شاہ خالد بادشاہ تھے، پھر بادشاہ کے بھائیوں کو ملے گی۔ سگے بھائیوں کو سب سے زیادہ، اور پھر بادشاہ کے ماں جائے بھائیوں کو ملے گی۔ جو مختلف ماؤں کی اولاد ہیں۔ پھر بادشاہ کے سگے بھتیجوں کو ملے گی۔ پھر ہوتے ہوتے نسبتاً دور کے بھائیوں کو ملے گی۔ بالآخر ہوتے ہوتے ان کی باری آئے گی جو عبدالعزیز کے دادا کی دوسری اولاد میں ہیں ان کو ملے گی۔ یہ کل تعداد ساڑھے تین ہزار تھی۔ ان ساڑھے تین ہزار میں جس کو سب سے کم رائلٹی ملتی تھی۔ وہ دس لاکھ ڈالرز روزانہ ملتی تھی۔ اب آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ ملک کی مجموعی دولت کتنی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ سعودیوں کے پاس یہ ساری دولت خرچ کرنے کے ذرائع نہیں تھے۔ انہوں نے جتنا بھی خرچ کیا یہ دولت کم نہ ہوئی، بڑھتی ہی چلی گئی۔ بعض ناقدین کے قول کے مطابق دولت کو انہوں نے نالیوں میں بہایا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ دولت کو بلا مبالغہ انہوں نے ہر طرح لٹایا۔ لیکن نالیوں میں لٹانے کے باوجود وہ ختم نہیں ہوتی تھی۔

یہ ساری کی ساری دولت امریکہ کے بینکوں میں جمع تھی۔ سالہا سال سے جب سے تیل

نکلنا شروع ہوا تھا، اس وقت سے ان کی دولت امریکہ کے بینکوں میں جمع ہوتی چلی آرہی تھی۔ اس کی مالیت جو کھربوں ڈالرز سے بھی بڑھ کر تھی امریکہ کے مختلف بینکون میں بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس کا سود ہی اتنا تھا کہ بعض ماہرین کہتے تھے کہ بہت جلد ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ سعودی عرب کا سارا نظام اس تیل کی دولت کے سود سے ہی چلے گا۔ ۱۹۸۲ء میں امریکی حکومت نے ایک قانون بنایا۔ اس قانون میں یہ لکھا تھا کہ اگر کسی غیر امریکی کی کوئی دولت امریکہ کے کسی بینک میں جمع ہو اور اتنے ڈالرز سے زائد ہو، (معمولی رقم تھی، شاید دس ملین، یا اس سے کچھ زیادہ) اور وہ سال میں دو فیصد سے زیادہ اس میں سے نکالنا چاہے تو اسے اسی وقت منجمد کر دیا جائے گا اور رقم نکالنے والے کو مزید رقم نکالنے سے روک دیا جائے گا۔

مجھے فوراً یہ پڑھ کر ایک دھچکا سا لگا کہ یہ تو میرے مسلمان بھائیوں کی دولت کو کھا جانے کا اور لوٹنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ میں نے اس قانون کا متن بہت تگ و دو کر کے حاصل کیا، اس کا عربی ترجمہ کیا۔ ایک مذکرہ تیار کیا اور ایک یادداشت اس موضوع پر لکھی۔ اس میں ان حضرات سے یہ گزارش کی (ان حضرات سے جن کے ملکوں کی دولت وہاں جمع ہے) کہ آپ کی جتنی بھی دولت اس وقت وہاں جمع ہے اس کا دو فیصد سے زیادہ تو آپ کبھی بھی نہیں نکال سکتے۔ اگر نکالیں گے تو آپ کی ساری دولت ضائع ہو جائے گی۔ کم از کم آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ آئندہ آپ اپنی دولت وہاں جمع نہ کروائیں اور جو جمع ہے اس کو کم از کم ڈیڑھ پونے دو فیصد سالانہ کے حساب سے نکالتے رہیں۔ اس طرح ۶۵، ۶۰ سال کے عرصے میں امید ہے کہ آپ اپنی دولت واپس لے سکیں گے۔ یہ سب کچھ میں نے بڑی محنت سے لکھا، اس زمانے میں نہ کمپیوٹر ہوتے تھے، نہ فوٹو اسٹیٹ مشینیں آسانی سے دست یاب ہوتی تھیں۔ بہت بھاگ دوڑ کر کے بڑی محنت سے اس یادداشت کو بہت خوب صورت ٹائپ کرایا۔ اور پھر ۸، ۶ ملکوں کے سفارتخانوں کو اور ان کے ذریعے وہاں کے حکمرانوں کو بھیجا۔ کسی ایک نے بھی جواب نہ دیا۔ کہیں سے یہ رسید بھی نہیں آئی کہ تمہارا خط مل گیا۔ کسی کے سیکریٹری یا چپڑاسی کی طرف سے بھی یہ اشارہ نہ ملا کہ آپ کا خط مل گیا ہے شکریہ۔ اس مثال سے آپ اندازہ کرلیں کہ ہمارے بھائیوں کی کتنی دولت وہاں جمع ہے، اور مغربی بینکوں کا نظام کیسے چل رہا ہے۔ اور اس بارے میں ان ممالک کے حکمرانوں

کے سوچنے کا انداز کیا ہے؟ اور امت مسلمہ کے مستقبل سے ان کی کس قدر ذہنی وفکری وابستگی ہے؟

پھر جب صدام حسین نے عراق پر قبضہ کیا۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا کہ باخبر لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے، لیکن جوں ہی یہ واقعہ پیش آیا فوراً امریکہ کی فوج سعودی عرب میں آکر اتر گئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے دفاع کے لئے اور کویت کو آزاد کرانے کے لئے آئے ہیں۔ ہماری افواج کے اس آنے کے اور جنگ کے سارے اخراجات آپ کے ذمے ہوں گے۔ پھر جن جن ملکوں سے ہم سلامتی کونسل میں عراق کے خلاف جنگ میں تائید حاصل کریں گے ان ملکوں نے ہم سے تائید فراہم کرنے کے عوض نقد رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ چین نے بہ قول ان کے ایک ارب ڈالر کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک ارب ڈالر کا مطالبہ کسی اور نے کیا تھا۔ یہ دونوں ممالک سلامتی کونسل کے ممبران تھے، یوں دو تین ارب ڈالر تو انہوں نے صرف رشوت کے نام سے، (میں تو رشوت ہی کہوں گا، آپ کا دل چاہے تو معاوضہ کہیں، یا تالیف قلب کہیں، جو بھی کہیں) یہ رقم انہوں نے تین ممبر ممالک کو اس لئے ادا کی کہ وہ امریکہ اور کویت کے حق میں ووٹ دیں، اور عراق کے خلاف امریکی اقدام کی تائید کے لئے ووٹ دیں۔ یہ تین ارب ڈالر دے کر کویت اور سعودی عرب نے گویا اقوامِ متحدہ سے امریکی حملہ کا جواز منوایا تھا۔ اس کے بعد امریکہ نے اگر ایک میزائل چلایا تو کویت اور سعودی عرب کو دس میزائلوں کا بل پیش کیا۔ اگر امریکا کا ایک سپاہی آیا تھا تو اس کی تعداد کئی گنا بتائی گئی، اس کی وہ تن خواہ رکھی گئی جو سعودی عرب میں شاید یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہی کی ہوتی ہوگی۔ یہ رقم ان کے سپاہیوں کی وہ تن خواہ تھی جو ان کو سعودی خزانے سے، کویت کے خزانے سے سال ہا سال دی گئی۔ جنگ کے جو اخراجات بتائے گئے تھے ان کا بل اتنا تھا کہ کسی کو آسانی سے یقین نہیں آئے گا۔ لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ ۱۹۹۰ء سے لے کر بعد کے کئی سالوں تک کویت اور سعودی عرب سے جو تیل امریکہ کو جاتا تھا وہ مفت جاتا تھا، بالکل بلا معاوضہ، اس لئے کہ ابھی تک وہ اخراجات پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس تیل کے لے جانے کا خرچہ بھی سعودی عرب اور کویت ادا کرتے رہے۔ تیل بھی مفت جاتا رہا اور جانے کا خرچہ بھی یہ دونوں ممالک دیتے رہے اور ابھی تک ان کا یہ بل پورا ادا ہوا یا نہیں ہوا، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

یہ صورت حال ہے دنیائے اسلام کی! ان حالات میں کیا بینکاری کا کوئی ایسا نظام وضع کیا جا سکتا ہے جو عالم اسلام کو اس اقتصادی غلامی سے نجات دلا سکے اور اسلامی شریعت کے مقاصد کی تکمیل میں مدد دے سکے۔ ان مثالوں سے یہ نہ سمجھیں کہ میں بلاوجہ خوف میں مبتلا کر رہا ہوں۔ ان گذارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ حقیقت ہمارے سامنے رہنی چاہئے کہ دنیائے اسلام اس وقت کم زوری اور بے بسی کی کس کیفیت میں ہے۔

دوسری اہم بات اللہ تعالیٰ نے اگر ایک چیز کو حرام قرار دیا ہے تو اس کے متبادل راستے بھی اس نے بتلائے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے سود کا ایک متبادل بتایا ہے تو وہ یقیناً قابلِ عمل بھی ہے اور ممکن بھی۔ لہٰذا کسی بھی بڑے سے بڑے خوف اور خطرے سے ڈر کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے، بلکہ قطرے سے نکلنے کا راستہ مل جل کر ہم سب کو تلاش کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نہ یہ کوئی مختصر کام ہے جو دو چار سال میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے، یہ ایک طویل اور جاں گسل عمل ہے جو طویل عرصے، شدید محنت، مکمل توجہ اور جرأت مندانہ فیصلوں کا متقاضی ہے۔ تبدیلی کا یہ پورا عمل متعدد مرحلوں اور منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی اپنے ہدف کو حاصل کرنے کی امید کر سکتا ہے۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ایک آدھ کتاب یا دو چار مقالے لکھ دینے سے یہ تبدیلی آپ سے آپ آنی شروع ہو جائے گی۔ بعض علما کرام کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ چوں کہ انہوں نے فتوے دے دیے ہیں اس لئے اب ان کی ذمے داری ختم ہوگئی ہے۔ اب اگر ان کے فتووں کے بعد بھی یہ استحصالی اور استعماری نظام جاری ہے تو اس کے ذمے دار صرف وہ لوگ ہیں جو اس نظام سے وابستہ ہیں، بلا شبہ اس نظام کے جاری رہنے میں بڑی ذمے داری ان ہی کی ہے جو یہ نظام چلا رہے ہیں، لیکن چیلنج اتنا بڑا اور مسئلہ اتنا گھمبیر ہے کہ قدم قدم پر مکمل تعاون، ہم آہنگی اور ہم قدمی درکار ہے۔

یہاں یہ بات ایک بار پھر واضح کر دینا ضروری ہے کہ بینکاری نظام جدید معاشیات و مالیات کا ایک شعبہ ہے، یہ ایک بہت بڑے کل کا ایک جز ہے۔ کل کی اصلاح کے بغیر جز کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

لیکن چوں کہ یہاں گفتگو بینکاری کے بارے میں ہو رہی ہے اس لئے سر دست پورے

نظام معیشت و مالیات پر گفتگو کو کسی اور فرصت کے لئے اٹھا رکھنا چاہئے اور صرف بینکاری کے نظام میں تبدیلیوں تک بات کو محدود رکھنا چاہئے۔

جدید نظام بینکاری کے فرائض

آج کل بینک جو کام کرتے ہیں یا جو ذمے داریاں انجام دیتے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ چوں کہ یہ ادارہ بہت ترقی کر گیا ہے اور آج دنیا کی تجارت اور صنعت کا بیشتر دارومدار بینکوں پر اس لئے بینکوں کے وظائف و فرائض بھی نہ صرف بہت بڑھ گئے ہیں بلکہ بہت پیچیدہ بھی ہو گئے ہیں۔

بینک کا ادارہ بہت سے جائز اور مثبت کام بھی کرتا ہے اور بعض ناجائز اور منفی کام بھی کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ بینکوں کا اگر کوئی کام مثبت اور مفید ہے تو وہ شرعاً قابل اعتراض نہیں ہے اور جائز کام ہے۔ یہ کام ماضی میں مختلف ادارے کیا کرتے تھے۔بعض اوقات غیر سرکاری افراد اور ادارے یہ خدمات انجام دیا کرتے تھے۔بعض اوقات ان جائز خدمات کے لیے سرکاری ادارے بھی موجود تھے جو یہ کیا کرتے تھے۔بعض علاقوں میں اور بعض اوقات یہ کام بیت المال نے اور دیگر سرکاری اداروں نے بھی انجام دیے ہیں۔

جو کام آج کل بینک کرتے ہیں وہ تقریباً بارہ قسم کے کام ہیں۔جن کی پوری تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔اختصار کے ساتھ بڑے بڑے کاموں کا ذکر کافی ہوگا۔

ا۔سب سے بڑا کام تو بینک یہ کرتے ہیں کہ لوگوں سے ان کی بچت یا زائد از ضرورت رقم لے کر اپنے پاس جمع رکھتے ہیں۔اس کا مقصد کیا ہے،اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ ایک لمبی بحث ہے۔جس کی پوری تفصیل بیان کرنے کا تو وقت نہیں،لیکن میں اختصار کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کروں گا۔انگریزی زبان میں اس رقم کے لیے جو بینک میں رکھوائی جائے ڈپازٹ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کے لغوی معنی کسی چیز کو کہیں رکھ دینے کے ہیں،بالخصوص ایسی جگہ رکھ دینے کے جہاں وہ محفوظ رہے۔

آج کل اس رقم کو عرب دنیا میں ودائع کہتے ہیں۔یہ ودیعۃ کی جمع ہے،عرب دنیا میں کچھ لوگ، اور خاص کر بعض مصری اہل علم یہ اصرار کرتے ہیں کہ یہ وہی اور اُسی انداز

کا ودیعہ ہے جس کا فقہ کی کتابوں میں ذکر ملتا ہے۔جس طرح ماضی میں ایک شخص ودیعہ کے طور پر اپنی رقم دوسرے کے پاس حفاظت کی خاطر رکھوادیا کرتا تھا، اسی طرح کا ایک ودیعہ یہ بھی ہے جو بینک کے پاس رکھا جاتا ہے۔ممکن ہے کسی سنجیدہ صاحب علم کے ذہن میں ایسا اشتباہ واقعتاً پایا جاتا ہو، لیکن اہل علم کی ایک بڑی تعداد اس کو فقہ اسلامی کے فنی مفہوم میں ودیعہ تسلیم نہیں کرتی۔اس لئے اس پر ودیعہ کے وہ احکام جاری نہیں ہوں گے جو فقہائے کرام نے ودیعہ کے فقہی تصور کو سامنے رکھ کر مدوّن کئے تھے۔

عربی زبان میں ودیعہ کے معنی، جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی چیز کو حفاظت کی غرض سے کسی دوسرے کی تحویل اور حفاظت میں دے دینے کے آتے ہیں۔فقہائے کرام نے ودیعہ کی جو تعریفات مرتب کی ہیں ان سب میں قدر مشترک یہی ہے۔ودیعہ کو بیشتر فقہا نے عقد کی ایک قسم قرار دیا ہے اور ان قرآنی آیات اور احادیث نبوی ﷺ سے اس کی مشروعیت اور جواز پر استدلال کیا ہے جن میں امانتوں کو ان کے مالکوں تک بہ حفاظت پہنچادینے کی تاکید کی گئی ہے۔

ودیعہ کو جو چیز بینکوں کے کھاتوں یا ڈپازٹس سے ممیز کرتی ہے وہ ودیعہ کا خالص امانت ہوتا ہے۔امانت کے بارے میں شریعت کا ایک عام اصول یہ ہے کہ اگر وہ امین کی طرف سے کسی کوتاہی، غفلت یا زیادتی کے بغیر ضائع ہوجائے تو امین اس کا ذمے دار نہیں ہے اور نہ اس نقصان کو پورا کرنے کا پابند ہے۔یہ اصول قرآن مجید کی آیت مبارکہ **ماعلی المحسنین من سبیل** (۱) کے علاوہ متعدد احادیث مبارکہ سے ماخوذ ہے۔علامہ سرخسی نے اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے جس میں آں جناب نے فرمایا تھا:

لاضمان علی رائح ولاعلی موتمن

دوسری طرف اس امر پر بھی فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ اگر ودیع (یعنی وہ شخص جس کے پاس ودیعہ رکھا گیا ہو) اس کو استعمال کرے یا اس سے کوئی فائدہ اٹھائے تو پھر وہ ودیعہ نہیں رہتا۔اس صورت میں وہ نقصان اور تاوان کا ذمے دار قرار پاتا ہے۔اس نوعیت کے ودیعہ کو مضمونہ کہا جاسکتا ہے، یعنی وہ ودیعہ جس کے نقصان کی تلافی کرنا ودیع کی ذمے داری ہو۔

۱۔التوبہ:۹۱

اسی طرح اگر ودیع مال ودیعہ کو اپنے یا کسی دوسرے کے اموال میں اس طرح ملادے کہ دونوں کو الگ الگ اور ممیز نہ کیا جاسکے تو بھی ودیع اس کی ادائیگی کا پابند اور نقصان کی تلافی کا ذمے دار ہے۔ یہی صورت جب ہوگی جب ودیع مال ودیعت سے تجارت شروع کردے۔ ان حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بینکوں کے کھاتے نہ مکمل طور پر قرض ہیں اور نہ روایتی فقہی انداز کا ودیعہ ہیں۔ بلکہ یہ ودیعہ مضمونہ کی ایک قسم ہیں جس کے بعض احکام قرض کے احکام سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے کہ قرض دین (Debt) کی ایک قسم ہے۔ دَین سے مراد وہ مال ہے جو کسی کے ذمے واجب الادا ہو۔ لہٰذا اگر بینکوں کے کھاتوں کو ودیعہ مضمونہ سمجھا جائے تو ان کی ادائیگی کی ذمے داری ودیع کی ہوگی، اور جس چیز کی ادائیگی کسی کے ذمے ہو وہ دَین شمار ہوتی ہے، اس لئے ودائع مضمونہ سب دین شمار ہوں گے اور ان پر دَین کے احکام جاری ہوں گے۔

ان ہی اسباب کی بنا پر دورِ جدید کے اکثر فقہائے کرام نے بینکوں کے کھاتوں کو روایتی فقہی مفہوم میں ودیعہ (یعنی خالص امانتی ودیعہ) تسلیم نہیں کیا۔ وہ اس کو قرض مانتے ہیں۔ لیکن بینکوں کے قوانین اور موجودہ دنیا کے رائج الوقت بینکاری اور مالیات کے قوانین اس رقم کو قرض نہیں کہتے۔ وہ اس کو ڈپازٹ ہی کہتے ہیں جو جدید بینکاری اصطلاح میں قرض سے مختلف چیز ہے۔ ڈپازٹ کا صحیح اردو یا عربی ترجمہ جو بھی ہو۔ عرب دنیا میں آج کل اس کا ترجمہ ودائع کیا جاتا ہے۔ لیکن ان رقوم کے بینکوں میں رکھنے کا یہ مقصد سب مانتے ہیں کہ لوگوں کی رقم محفوظ رہے اور ایسی جگہ اس کو رکھا جائے جہاں چوری کا خدشہ نہ ہو، اگرچہ چوری اور ڈاکے آج کل بینکوں میں بہت پڑ رہے ہیں، لیکن چوں کہ بینکوں نے اس رقم کی ادائیگی کی گارنٹی دے رکھی ہے۔ اس لئے لوگوں کا سرمایہ عام طور پر محفوظ ہی رہتا ہے۔

اب ودیعہ کی گارنٹی دی جاسکتی ہے یا نہیں دی جاسکتی اور کن حالات میں دی جاسکتی ہے، اس پر لمبی بحثیں ہیں۔ فقہا نے تفصیل سے اس پر کلام کیا ہے۔ اکثر فقہا کا رجحان یہ ہے کہ ودیعہ جب تک ودیعہ ہے اس کی گارنٹی نہیں ہوسکتی۔ ودیعہ غیر مضمون ہے۔ اس لئے کہ امانت ہے اور یدالامین غیر ضامنۃ۔ یہ کلیہ ہے اور فقہا کے ہاں متفق علیہ ہے۔

بہ ہر حال بینکوں کا سب سے بڑا اور سب سے نمایاں کام یہی ہے کہ وہ لوگوں کی بچتیں اپنے پاس رکھتے ہیں اور اس رقم کو آگے قرض پر دیتے ہیں۔ گویا بینک وہ ودیع ہیں (اگر بینکوں

کے کھاتوں کو ودیعہ کہنے پر اصرار کیا جائے) جو مال ودیعت سے تجارت کرتے ہیں۔اس لئے وہ ان رقوم کی محفوظ واپسی یا واپس ادائیگی کے پابند ہیں۔یہ ایک سب سے بڑا کام ہے جو بینک کرتے ہیں۔

۲۔بینکوں کا دوسرا بڑا کام جو اسی پہلے کام کا دوسرا جز ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس جمع شدہ رقم سے تجارت اور کاروبار کے خواہش مند لوگوں کو قرضے دیتے ہیں۔قرضوں کا جتنا بڑا کاروبار بینکوں کے ذریعے ہوتا ہے وہ نہ دنیا کی تاریخ میں کبھی ہوا ہے۔نہ کسی اور ادارے کے تحت ہورہا ہے۔اس وقت دنیا میں جتنے کاروبار چل رہے ہیں،جتنی صنعت کاری اور سرمایہ کاری ہورہی ہے اس کا غالب ترین حصہ قرض کی بنیاد پر ہورہا ہے۔قرضوں پر مبنی معیشت کا یہ پورا نظام عام طور پر شریعت کے احکام وقواعد سے براہ راست متعارض ہے یا نہیں،میں اس بحث میں نہیں جاتا،لیکن کم از کم میری ذاتی اور ناچیز فہم میں یہ نظام شریعت کی روح سے ضرور متعارض ہے۔

حدیث کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرض لینا اور دینا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض لینے اور دینے سے پناہ مانگی ہے۔

اللھم انی اعوذبك من الدّین و غلبة الرجال

اے اللہ میں قرض اور لوگوں کے غالب آجانے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

جس چیز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی پناہ مانگی ہو اور صحابہ کو بھی یہی سکھایا ہو کہ اس سے پناہ مانگیں۔وہ چیز اسلام میں کاروبار کی بنیاد نہیں بننی چاہئے،اور اسلام کے مزاج کے خلاف سمجھی جانی چاہئے۔اگر یہ چیز اسلام کے مزاج کے خلاف ہے تو پھر بینکاری کی ساری اٹھان اسلام کے مزاج کے خلاف قرار دینی پڑے گی۔یاد رہے کہ یہاں قرض نہیں،دَین سے پناہ مانگی گئی ہے جو قرض کے مقابلے میں زیادہ عام اور زیادہ وسیع اصطلاح ہے۔

۳۔تیسرا اہم اور بڑا کام جو بینک کرتے ہیں،جو خاصے بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اس کو ڈسکاؤنٹنگ کہتے ہیں۔ڈسکاؤنٹنگ آف بلز یا خصم الاوراق التجاریة کی حقیقت یہ ہے کہ کاروباری لوگ ایک دوسرے کو جو قرض دیتے ہیں،اس کی ایک رسید یا ہنڈی جاری ہوتی ہے۔ یہ ہنڈی یا رسید کبھی سال بھر کی ہوتی ہے کبھی چھ مہینے کی ہوتی ہے اور مقررہ وقت پر واجب الادا

ہوتی ہے۔اگر وقت سے پہلے کوئی شخص اس کو بھنانا یعنی رقم وصول کرنا چاہے تو بینک اس ہنڈی میں مذکور اصل رقم سے کم قیمت میں اس کو لے لیتا ہے۔اور وقت پر اصل رقم دینے والے سے پوری رقم وصول کر لیتا ہے۔

یہ بینکوں کے کاروبار کا ایک بہت بڑا حصہ ہے جس سے بینکوں کو اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔اسٹیٹ بینک آف پاکستان جو پاکستان کا مرکزی بینک ہے وہ بھی بڑے پیمانے پر ڈسکاؤنٹنگ کا یہ کام کرتا ہے۔نہ صرف پاکستان کا بلکہ دنیا کا ہر مرکزی بینک اپنے کاروبار یا اپنے معاملات اور آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ خصم الاوراق التجاریہ کو قرار دیتا ہے اور اس سے مرکزی بینکوں کو بڑی آمدنی ہوتی ہے۔

ڈسکاؤنٹنگ کے اس تصور اور اس کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اوراق تجاریہ یا دستاویزات قابل بیع وشرا کو سمجھ لیا جائے جن کو انگریزی میں Negotiable Instruments کہا جاتا ہے۔اس اصطلاح کا اردو ترجمہ جو عام طور پر قانون کی اردو کتابوں میں کیا جاتا ہے وہ دستاویزات قابل بیع وشرا ہے۔ان دستاویزات میں چیک، ہنڈیاں، بل آف ایکسچینج، پرومیسری نوٹ، ڈیبنچر وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ان سب کی الگ تفصیلات اور شرائط واحکام قانون کی کتابوں بالخصوص قانون دستاویزات قابل بیع وشرا Negotiable Instruments Act اور کمپنیز آرڈیننس میں موجود ہیں۔

ڈسکاؤنٹنگ یوں تو سب بینک کرتے ہیں، لیکن ڈسکاؤنٹنگ کا کام بہت بڑے پیمانے پر مرکزی بینک کرتا ہے۔ڈسکاؤنٹنگ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ایک بینک، کمپنی یا ایک شخص نے دوسرے کسی شخص کو قرضے کی رسید جاری کی جو ایک سال کے بعد واجب الادا ہوگا۔اب یہ شخص یعنی حامل رسید مقررہ مدت سے پہلے ہی رقم کی وصولی چاہتا ہے۔مثلاً ایک سال کے بعد اس کو بینک سے یا کسی کمپنی وغیرہ سے ایک لاکھ روپے وصول کرنے تھے، لیکن اس کو اس رقم کی آٹھ مہینے بعد ہی فوری ضرورت پیش آگئی۔اب وہ اس رسید (یا دستاویز) کو کسی بینک کے ہاتھ کم قیمت پر، مثلاً نوے ہزار روپے میں، فروخت کر دیتا ہے۔اس طرح اس کو مقررہ وقت سے پہلے ہی (لیکن اصل رقم سے کم) رقم مل گئی جو اس کو فوری ضروریات کے لئے درکار تھی۔اب جس بینک نے وہ دستاویز خریدی ہے وہ چار مہینے بعد اُس اصل بینک یا کمپنی سے جہاں سے

رقم ملنا تھی پوری رقم ایک لاکھ روپے وصول کرے گا۔ یوں ڈسکاؤنٹنگ کرنے والے اس بینک کو نوے ہزار کے ایک لاکھ وصول ہو گئے۔

یہ کام بینکوں میں بہت کثرت سے ہوتا ہے اور یہ بینکوں کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ بلکہ مرکزی بینکوں کے معاملات کا خاصا بڑا حصہ اسی نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کو مختلف ناموں اور عنوانات سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً مرکزی بینکوں کی عام اصطلاح ہے: اوپن مارکیٹ آپریشنز، یعنی آزاد منڈی کے معاملات یا منڈی کی آزاد سرگرمیاں۔ ان میں ایک اہم حصہ اسی ڈسکاؤنٹنگ کا ہوتا ہے۔

اس کے بارے میں جدید دور کے اہل علم کے ہاں خاص طویل بحثیں رہی ہیں کہ ان معاملات کی شرعی حیثیت کیا قرار دی جائے۔ اس عمل یعنی ڈسکاؤنٹنگ کو آج کل کے عرب اہل علم خصم الاوراق المالیة یا حسم الاوراق المالیه کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں جو میری ذاتی رائے میں درست نہیں ہے۔ اس لئے خصم یا حسم کی اصطلاح ایک طویل عرصے سے عرب دنیا میں قیمت میں رعایت دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جب دکان دار کسی خاص گاہک کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی خاطر قیمت میں کمی کر دیتا ہے تو اس رعایت کو خصم یا حسم کہا جاتا ہے۔ لیکن دوسری بہت سی بے ضرر اصطلاحات کی طرح یہ اصطلاح بھی بینک ڈسکاؤنٹ کے لئے استعمال کی جانے لگی ہے جو عربی زبان کے اصل خصم یا حسم سے خاصی مختلف چیز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بینک کے سود کی برائی اور حرمت کو ذرا پوشیدہ رکھنے کے لئے اس کو اردو میں منافع اور عرب دنیا میں فائدہ کہا جانے لگا ہے۔

بہ ہر حال اس خصم یا حسم یا ڈسکاؤنٹنگ کے جواز اور عدم جواز پر دنیائے عرب کے علمی اور فقہی حلقوں میں خاصی گفتگو رہی ہے۔ بیشتر اہل علم کی رائے میں یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ سود ہی کی ایک دوسری (منفی) صورت ہے۔ وقت اور مہلت کی قیمت، جس کے لیے ٹائم ویلیو آف منی یا Opportunity Cost کی اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ سب باتیں یہاں ڈسکاؤنٹنگ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس لئے جو حضرات اس کو ناجائز اور شریعت سے متعارض قرار دیتے ہیں ان کی رائے بہت وقیع اور وزنی ہے۔

یہ چیز اگر شریعت سے متعارض ہے۔ اور میری ذاتی رائے میں یقیناً متعارض ہے۔ تو پھر

جلد از جلد اس کو ختم کیا جانا چاہئے۔اگر ڈسکاؤنٹنگ کے اس پورے نظام کو ختم کر دیا جائے تو کیا اس کا متبادل تلاش کیا جا سکتا ہے جو شرعاً قابل قبول بھی ہو اور بینک کے لئے قابل عمل بھی ہو، تاکہ جو آمدنی بینکوں کو اس ذریعے سے ہو رہی ہے اس آمدنی کے لئے متبادل ذرائع اختیار کئے جا سکیں۔ بینک یہ سوال کرنے میں حق بہ جانب ہیں کہ اتنی بڑی آمدنی کے اچانک بند ہو جانے سے جو مسائل پیدا ہوں گے ان سے کیسے نمٹا جائے۔

بعض معاصر فقہا نے صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد کی روایت (ضعوا وتعجلوا) سے جو بنی نضیر کے بارے میں ہے استدلال کیا ہے اور اس کی بنیاد پر ڈسکاؤنٹنگ کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یوں گویا ایک راستہ نکالا ہے۔لیکن جمہور علماء نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ بڑے بڑے ائمہ فقہ اور فقہی مسالک کے نزدیک ضعوا وتعجلوا کی وقتی اور استثنائی اجازت کو کے عمومی اصول قرار دینا درست نہیں ہے۔ اس پر بھی لمبی بحثیں آج کل کے فقہانے کی ہیں کہ ضعوا وتعجلوا کے اصول کا اطلاق یہاں ہو سکتا ہے یا نہیں؟ عام طور پر علمائے کرام کا کہنا یہی ہے کہ ضع وتعجل یا ضعوا وتعجلوا کا حکم عام تجارتی معاملات پر منطبق نہیں ہوتا۔ائمہ اربعہ کا یہی نقطہ نظر ہے۔ فقہ حنبلی میں علامہ ابن تیمیہ نے پہلی بار (دوسرے متعدد معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی) ائمہ اربعہ کی رائے سے اختلاف کیا اور بعض شرائط کے ساتھ ضع وتعجل کے اصول کو جائز قرار دیا۔ لیکن علامہ ابن تیمیہ کی رائے میں اس کا اطلاق ذاتی قرضوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک لاکھ روپے ایک سال کے لئے قرض لئے۔ یا کسی سے ایک لاکھ روپے کی کوئی چیز خرید لی اور ایک سال کے بعد رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔اب رقم وصول کرنے والے کو سال بھر سے پہلے ہی رقم کی ضرورت پڑ گئی۔اب ضع وتعجل کے اصول کے تحت اگر دونوں فریق اتفاق رائے سے یہ طے کر لیں کہ رقم مقررہ مدت سے قبل ادا کر دی جائے لیکن بہ جائے ایک لاکھ کے صاحب معاملہ نوے ہزار قبول کر لے تو امام ابن تیمیہ کے نزدیک یہ جائز ہے، بہ شرطے کہ پہلے سے یہ بات طے شدہ نہ ہو اور اس میں کوئی تیسرا فریق درمیان میں نہ آئے۔

علامہ ابن تیمیہ کے اس موقف کو ان کے بعض تلامذہ اور ان کے بعد بعض حنبلی فقہا نے بہت زور وشور اور کثرت سے دہرایا۔لیکن ان میں سے کسی نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اس عمل کو ایک

طے شدہ اور مشروط عمل بنانا بھی جائز ہے اور یہ کہ اس کی بنیاد پر باقاعدہ بازار میں کاروبار کی بھی اجازت ہے۔ حسم الاوراق المالیہ یا ڈسکاؤنٹنگ کے بارے میں قریب قریب تمام معاصر علما کی رائے یہی ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ خود معاصر سعودی علما (جو علامہ ابن تیمیہ کے اجتہادات کے بہت پرجوش مویدین میں سے ہیں) ڈسکاؤنٹنگ کو ناجائز ہی سمجھتے ہیں۔ جدہ کی بین الاقوامی فقہ اکیڈمی کے فیصلے کی رو سے ڈسکاؤنٹنگ ناجائز ہے۔ لیکن فریقین اگر آپس میں (کسی پیشگی شرط کے بغیر) مدت ادائیگی میں کمی کے بدلے میں رقم میں بھی کمی پر اتفاق کرلیں (اور اس عمل میں کوئی تیسرا فریق شریک نہ ہو) تو ایسا کرنا شرعاً درست ہے۔ اور یہی علامہ ابن تیمیہ کا بھی موقف ہے۔

۴۔ چوتھا کام جو بینک کرتے ہیں یہ وہ ہے جس کو آج کل عربی میں کمبیالہ کہتے ہیں۔ یہ کسی فرانسیسی لفظ کا معرب ہے۔ انگریزی میں اس کو بل آف ایکسچینج کہتے ہیں۔ یہ ہنڈی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ بیرون ملک کسی تاجر یا صنعت کار سے مل کر کوئی تجارت یا کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ اور باہر کے کسی ملک میں آپ کو غیر ملکی کرنسی میں پیسہ جمع کرنا ہے۔ مثلاً کوئی مشینری جرمنی سے منگوانی ہے۔ تو آپ کو اس مشینری کی قیمت جرمنی میں کسی ایسی کرنسی میں جمع کرانی ہوگی جس پر فریقین اتفاق کریں۔ اب آپ یہاں پاکستانی کرنسی میں بینک کو رقم دے دیں۔ بینک آپ کی طرف سے جرمنی کے کسی بینک میں حساب کھولے گا۔ اور وہاں ایک کمبیالہ ایشو کر کے مشینری کے بائع کو رقم ادا کردے گا۔ یوں آسانی سے رقم مشینری کے بائع کو ادا ہو جائے گی اور مشینری آپ کے پاس آجائے۔ پھر آپ یہاں بقیہ رقم بینک کو ادا کر کے حساب صاف کرلیں گے۔ وصول یابی کی رسید جس کو بل آف لیڈنگ کہتے ہیں۔ وہ وصول ہو جائے گی تو آپ بقیہ ادائیگی بھی اگر ہے تو کردیں گے۔ یہ ایسا کام ہے جو بہ ظاہر جائز معلوم ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج کل تجارت اور کاروبار میں بہت مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ آپ بہ راہ راست جرمنی جا نہیں جا سکتے۔ آپ کے لئے یہاں سے بہ راہ راست رقم فراہم کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ اگر ایک مرتبہ فرض کیجئے کہ آپ چلے بھی جائیں تو یہ کافی نہیں ہے۔ اگر روزانہ کاروبار ہو رہا ہو تو آپ کے لئے ہر کاروبار کے لئے روز روز غیر ممالک جانا ممکن نہیں

ہے۔اس لئے بینک آپ کے وکیل یا ایجنٹ کے طور پر اس کام کو کرتا ہے۔آپ یہیں سے بیٹھے بیٹھے بینک کی فیس ادا کر دیتے ہیں۔فیس ادا کرنے میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ یہ ایک جائز اور مفید خدمت ہے جو بینک نے انجام دی ہے۔بینک اس خدمت کی اجرت یا حق الخدمت لے سکتا ہے۔بہ شرطے کہ کرنسی کا جو لین دین ہے وہ شریعت کے احکام کے مطابق ہو۔کرنسی کا لین دین بیع صرف کی ایک قسم ہے۔اگر صرف کے آداب اور احکام کی پابندی کی جائے تو اس لین دین میں کوئی چیز شرعاً قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی۔بیع صرف سے مراد وہ بیع وشدا ہے جو ایک زر کی دوسرے زر سے یا ایک ثمن سے money کی دوسری ثمن یا money سے ہو۔

۵۔اسی کا ایک حصہ خطاب الضمان ہے۔آپ کو ایل سی کھولنی پڑے گی۔پہلے آپ لیٹر آف کریڈٹ کھولیں گے۔لیٹر آف کریڈٹ کے معنی ہیں کہ پہلے آپ بینک کو درخواست دیں گے۔بینک سے قرضہ لیں گے۔پھر آپ بینک سے درخواست کریں گے کہ وہ آپ کی طرف سے جرمنی میں مشینری کے تاجر کو مطلوبہ رقم کی ادائیگی کر دے۔اس کو ایل سی یا لیٹر آف کریڈٹ یا خطاب الضمان کہتے ہیں۔یہ بھی جائز معلوم ہوتا ہے۔اس میں بھی کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

۶۔چھٹا کام جو بینک کرتے ہیں، وہ تحویل قروض ہے۔یہ اس حوالے کی ایک قسم ہے جس کا تذکرہ فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔افراد کی بہ نسبت آج یہ کام بینک بہت آسانی اور تیزی سے کر سکتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے پاس بڑے بڑے وسائل ہوتے ہیں۔اور جس کو آج کل عربی میں سیولہ یا انگریزی میں لیکویڈیٹی کہتے ہیں، وہ مطلوبہ مقدار میں بینکوں کے پاس ہی دست یاب ہوتی ہے۔اس سے مراد نقد رقم ہے۔نقد رقم اکثر اوقات کاروباریوں کے پاس موجود نہیں ہوتی۔ان کی ساری یا بیشتر رقم سرمائے اور کاروبار میں لگی ہوتی ہے۔ان کی بیشتر دولت کاروبار میں لگے ہوئے سرمائے کی شکل میں، تجارت کی یا سامان تجارت کی شکل میں موجود ہوتی ہے، نقد رقم بڑی مقدار میں عموماً تاجروں کے پاس موجود نہیں ہوتی۔البتہ بینکوں کے پاس نقد رقم وافر مقدار میں دست یاب ہوتی ہے اس لئے بینک آپ کے قرضے کی رقم کسی دوسرے کو ادا کرنے میں آپ کی مدد کرتا ہے، اور یہ ایک

ضروری خدمت ہے، یہ بھی بظاہر جائز معلوم ہوتی ہے،اس میں بھی کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ بہ شرطے کہ حوالے کے احکام کے تحت اس کو ٹھیک طریقے سے انجام دیا جائے۔

۷۔ واضح رہے کہ حوالے کے بعض احکام کی بنیاد پر جدید اسلامی بینکاری کے لئے قواعد ضوابط کی تیاری کا کام کئی سال قبل مکمل ہو چکا ہے۔ بحرین میں قائم اسلامی مالیاتی اداروں کی بین الاقوامی تنظیم هيئة المحاسبه والمراجعة للمؤسسات الماليه الاسلاميه نے ۲۰۰۲ء میں حوالے کا ایک شرعی معیار یعنی معیاری دستاویز اور قواعد نامہ مرتب کر دیا تھا۔ یہ ادارہ جو انگریزی مخفف نام آیوفی (AAOIFI) کے نام سے مشہور ہے دنیائے اسلام کے صف اول کے فقہا کرام کے مشورے اور راہ نمائی میں کام کرتا ہے اور اس نے اسلامی بینکاری اور سرمایہ کاری میں کام آنے والے عقود اور معاملات کے لئے ۳۰۔ ۳۵ کے لگ بھگ شرعی معیارات، معاییہ شرعیہ یا شریعہ اسٹینڈرڈز تیار کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے اسلامی بینکاری اور اسلامی سرمایہ کاری کا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔

اس لئے اب ہم مکمل اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بینکوں اور مالیاتی اداروں کی طرف سے جو دستاویزات قابل بیع وشرا جاری ہوتی ہیں وہ اگر حوالے کے اسلامی احکام کے مطابق ہوں تو جائز ہوں گی۔ ان احکام کا خلاصہ آیوفی کے مذکورہ بالا معیار نامے میں آ گیا ہے۔

۸۔ بینکوں کا ایک اور اہم کام لوگوں کی قیمتی دستاویزات، زیورات اور دیگر اشیا کی حفاظت کا بندوبست بھی ہے۔ یہ کام حفاظت ودائع کہلاتا ہے۔ ودائع سے مراد یہاں وہ رقم نہیں ہے جو آپ بینک میں جمع رکھتے ہیں۔ اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہاں ودائع سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی آپ کو حفاظت مطلوب ہے۔ مثلاً اپنی کچھ دستاویزات، زیورات یا دیگر قیمتی اشیا آپ محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً آپ اپنے جواہرات محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس غرض کے لئے بینکوں کے پاس سیف ڈیپازٹ ہوتا ہے، مضبوط کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اس میں لوہے کی مضبوط الماریاں ہوتی ہیں۔ ان کی ایک چابی آپ رکھتے ہیں، دوسری چابی بینک رکھتا ہے۔ اس میں آپ اپنی دستاویزات یا قیمتی چیزیں محفوظ رکھ لیں۔ یہ بھی ایک جائز اور مفید خدمت ہے۔ بینک اس کا معاوضہ لیتا ہے۔ یہ خدمت بھی جائز ہے اس کا معاوضہ بھی جائز طور

پر بینک لے سکتا ہے۔اس کام کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ یہ وثائق کی حفاظت بھی ہے۔ودائع کی حفاظت بھی ہے۔

۹۔بینکوں کے وظائف میں ایک اور چیز ہے جس کو آج کل عرب دنیا میں اعمال السمسرہ کہتے ہیں۔ بینک مختلف معاملات میں آپ کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔فرض کیجئے آپ بہت بڑے کاروباری یا بزنس مین ہیں۔آپ نے کوئی بڑی عمارت انگلینڈ میں خرید لی۔اب اس عمارت کو کرائے پر دینا ہے۔اس کے کرائے داروں سے کرایہ وصول کرنا ہے۔اس کرائے کو کہاں لگانا ہے، کس کاروبار میں لگانا ہے۔کس کمپنی کے شیئر خریدنے ہیں یا رقم کو انگلستان سے وصول کرکے پاکستان بھیجنا ہے۔ یا آپ کو جرمنی میں کسی کاروبار کی ادائیگی کرنی ہے یا ہانگ کانگ یا سنگاپور سے آپ نے کوئی چیز منگوائی ہے۔وہاں ادا کرنی ہے۔ان سب کاموں کے لئے آپ کسی ایک بینک کو اپنا وکیل مقرر کردیں وہ آپ کے نائب کے طور پر، آپ کے وکیل کے طور پر، آپ کے لئے سارے کام کردیتا ہے۔اس میں نوعیت کے کاموں بھی کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔اور یہ چیز بھی جائز ہے اس کا جو معاوضہ بینک وصول کرے وہ بھی جائز ہے۔

۱۰۔دسواں کام جو دراصل بینکوں کا اصل اور سب سے بڑا کام ہے وہ سرمایہ کاری کا ہے۔بینکوں کے پاس جو رقوم حفاظت کے لئے رکھی جاتی ہیں بینک ان کو اپنے پاس بے کار نہیں پڑا رہنے دیتے، بلکہ اس رقم کو مزید رقم حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بینکاروں کے حلقوں میں مشہور ہے کہ سرمایہ سرمائے کو کھینچتا ہے۔واقعہ بھی یہی ہے کہ بینکوں کے پاس عامۃ الناس کا جو بہت بڑا سرمایہ محفوظ ہوتا ہے اگر وہ سارے کا سارا نہیں تو اس کا بیشتر حصہ مزید سرمایہ کھینچنے پر خرچ ہوتا ہے۔

اگر یہ سرمایہ کاری جائز خطوط پر ہو اور شریعت کی حدود کے اندر رہ کر ہو تو یقیناً یہ ایک بہت مفید کام اور ایک بڑی تعمیری خدمت ہے۔لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔روایتی بینکوں کے کام کا بہت بڑا حصہ سرمایہ کاروں، تاجروں اور صنعت کاروں کو قرض دینے اور اس قرض پر سود وصول کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔قرضوں کے اس کاروبار کی بینکوں کے کام میں اتنی بنیادی اہمیت ہے کہ دراصل یہی کام بینکاری کی اصل بنیاد ہے۔دنیا میں بینکاری کے رائج الوقت قوانین کی رو سے بینک کی تعریف ہی یہ ہے کہ بینک سے مراد وہ ادارہ ہے جو قرضوں کا کاروبار

کرتا ہو۔مغربی ممالک میں خصوصاًاور دنیائے اسلام میں عموماً بینکوں کے لئے خود کسی کاروبار، تجارت یا صنعت کاری میں حصہ لینا ممنوع ہے۔اگر کوئی بینک خود کوئی کاروبار یا تجارت کرنے لگے تو اس کو تسلیم شدہ بینکوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے۔گویا بینک کی ''بینکیت'' کا دارومدار قرضوں کے کاروبار پر ہے۔

اگر بینک ان تمام رقوم کو جائز سرمائے میں لگائے تو اس میں نہ صرف یہ کہ شرعاً کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ یہ بہت اچھا کام ہے اور شرعاً پسندیدہ بھی ہے کہ لوگوں کی رقوم جو بے کار پڑی ہوں ان کو مفید اور تعمیری سرمایہ کاری میں لگا دیا جائے۔یوں سرمایہ کاری سے تجارت کو بھی فروغ ہو، روزگار میں بھی اضافہ ہو۔اس کا فائدہ معاشرے کو بھی ہو، بینک چلانے والے کو بھی ہو، اور جن کی رقمیں ہیں ان کو بھی گھر بیٹھے جائز فائدہ ہو۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جتنی سرمایہ کاری بینکوں کی طرف سے ہوتی ہے وہ عموماً جائز سرمایہ کاری نہیں ہوتی۔بینکوں کے لئے اس وقت آسان ترین اور محفوظ ترین راستہ یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی بچت کی رقوم جمع کرتے ہیں اور ان رقوم کو آگے قرض پر دے دیتے ہیں۔دس فیصد سود پر مثلاً قرض پر رقم دی۔یہ دس فیصد جو سود آیا اس میں سے چھ یا سات فیصد اصل مالکان کو دیا۔بقیہ چار فیصد، تین فیصد خود رکھ لیا۔بہرحال اس سود کا ایک حصہ بینک خود رکھ لیتے ہیں دوسرا بقیہ حصہ اصل مالکان کو ادا کر دیتے ہیں۔رہی یہ بات کہ واقعتاً کتنا سود لوگوں سے وصول کرتے ہیں اور اس میں سے کتنا اصل کھاتہ داروں کو ادا کرتے ہیں یہ معلوم نہیں، یہ بینکوں کے مالکان کو ہی معلوم ہوتا ہے۔بینکوں کا عام طریقہ کار یہ ہے کہ وہ مختلف لوگوں سے مختلف شرح سود پر معاملہ کرتے ہیں۔ان معاملات میں سے ہر ایک کی الگ الگ شرائط اور تفصیلات طے ہوتی ہے جن کے مطابق یہ سارا کام انجام پاتا ہے۔چوں کہ یہ ساری آمدنی سود کی ہوتی ہے اس لئے اس کا جو حصہ اصل کھاتہ داروں کو ملتا ہے وہ بھی سود ہی ہوتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ بینکوں کی جو آمدنی اب تک ہو رہی ہے یا مختلف ملکوں میں ہوتی ہے وہ بلاشبہ سود ہی کی آمدنی ہے۔اس کے ربوی اور سودی آمدنی ہونے میں کوئی شک نہیں۔اس لئے یہ اضافی رقم جو بینک منافع کے نام سے دیتے ہیں۔قبول کرنا جائز نہیں۔

یہی عام طور پر علمائے کرام کی رائے ہے۔یہ اس رقم کے بارے میں ہے جو سیونگ

اکاؤنٹ میں رکھی ہو، اور اس پر منافع کے نام پر اضافہ مل رہا ہو۔ اس لئے کہ سیونگ اکاؤنٹ میں جو اضافہ کھاتہ داروں کو ملتا ہے، وہ سود ہی کی رقم سے ادا کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس کرنٹ اکاؤنٹ میں اضافہ نہیں ملتا۔ کرنٹ اکاؤنٹ کے معنی یہ ہیں کہ آپ جب چاہیں اپنی رقم جتنی چاہیں لے سکتے ہیں، اس میں کوئی اضافہ نہیں ملتا۔ لیکن بینک اس رقم کو بھی قرض میں استعمال کرتا ہے اور آگے سود پر لگاتا ہے۔ پاکستان میں اور کئی ممالک میں اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ بعض مشورے علمائے کرام کی طرف سے بینکوں کے ذمے دار لوگوں کو دیئے گئے۔ تجاویز بھی پیش ہوئیں۔ میں ابھی ان کی طرف آتا ہوں۔

اس باب میں تو کوئی اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ آج کے کاروباروں اور تجارت اور صنعت کی پیچیدہ صورتوں کے احکام وضع کرنا اور ان میں حلال و حرام اور مکروہ یا غیر مکروہ کا تعین کرنا بہت مشکل کام ہے اور بہت بھاری ذمے داری ہے۔ دوسری طرف یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دنیا بھر کا مالیاتی نظام مغربی بینکوں اور ان کے بڑے بڑے مالیاتی اداروں سے وابستہ ہے جس میں یک طرفہ طور پر بڑی بڑی تبدیلیاں کر دینا آسان کام نہیں، خاص طور پر تبدیلی کے آغاز میں انقلابی قسم کے بڑے بڑے اقدامات سے ساری کوشش متاثر ہو سکتی ہے۔

یہ بات کہ عامۃ الناس کی بے کار رقوم کو یک جا کر کے بڑے بڑے کاروباروں اور تجارتی یا صنعتی منصوبوں میں لگایا جائے ہرگز قابل اعتراض نہیں۔ بلکہ ایسا کرنا شرعاً بھی ضروری ہے اور اقتصادی مصالح کے لحاظ سے بھی ناگزیر ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں اتنے بڑے بڑے صنعتی منصوبے وجود میں آ گئے ہیں کہ ان میں لگانے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا ایک یا چند افراد کے بس کی بات نہیں۔ بعض منصوبے (مثلاً ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے) کھربوں روپے کی مالیت کے ہوتے ہیں۔ اگر ان میں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد سرمایہ نہ لگائیں تو ایسے منصوبے چل ہی نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ صنعت کاروں اور ان لاکھوں سرمایہ کاروں کے مابین براہ راست رابطہ آسان نہیں۔ اس غرض کے لئے بینک دونوں کے درمیان واسطے کا کام کرتا ہے۔

لہٰذا اہل علم نے بجا طور پر اس پورے عمل کو مشارکہ یا مضاربہ کے احکام کی بنیاد پر مرتب و منظم کرنے کی دعوت دی۔ آج سے نصف صدی قبل بلکہ اس سے بھی پہلے سے یہ بات اہل علم

کے مابین متفق علیہ چلی آرہی ہے کہ بینکوں کے اس بنیادی کام کی بہترین اور مناسب ترین قابل عمل اور جائز صورت مضاربہ اور مشارکہ ہے، جس کے ذریعے بینکوں کے پاس موجود رقوم کو تعمیری اور پیداواری مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ گیارہواں کام بینک یہ کرتا ہے کہ اوراق تجاریہ یعنی مالی دستاویزات جاری کرتا ہے۔ مختلف بینک خاص طور پر بڑے بڑے بینک اپنی اپنی مالی دستاویزات اور اپنے اپنے تجارتی اوراق جاری کرتے ہیں۔ آج کل تجارتی اوراق کی بہت ساری قسمیں ہو گئی ہیں۔ ان سب کو انگریزی میں Negotiable Instruments کہتے ہیں، یعنی اوراقِ تجارت یا دستاویزات قابل بیع وشرا۔ یہ وہ اوراق یا دستاویزات ہیں جو خود اپنی جگہ قابل بیع وشرا ہیں۔ ایک شخص نے یا ایک بینک نے ہنڈی یا سیکورٹی یا کوئی اور دستاویزات جاری کی ہے جو ایک خاص رقم مثلاً ایک لاکھ روپے کی حامل ہے۔ یہ دستاویز بازار میں اسی طرح قابل بیع وشرا ہوتی ہے جس طرح کسی مال کی بیع وشرا ہوتی ہے۔ اس لئے ان دستاویزات کو مال اور نقد رقم ہی کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ دستاویزات قابل بیع وشرا کے کاروبار کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض جائز ہیں اور بعض ناجائز ہیں۔ ناجائز نوعیت کے لین دین پر شرعاً دو بڑے اعتراضات وارد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے جواز میں اہل علم کو بجا طور پر تامل رہا ہے۔

ایک تو یہ کہ ان دستاویزات کی خرید وفروخت کی بہت سی شکلیں بیع الدین بالدین کے دائرے میں آتی ہیں، جو حدیث کی رو سے ناجائز ہے۔ روایت میں آتا ہے:

نهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عَنْ بیع الکالیٔ بالکالیٔ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واجب الادا قرض یا دین کی ایسے ہی واجب الادا قرض یا دین کی آپس میں خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے۔

لہٰذا بیع الکالی بالکالئی ہونے کی وجہ سے لین دین کی بہت سی شکلیں جو ان قابل بیع وشرا دستاویزات کے ذریعے ہوتی ہیں وہ جائز نہیں ہیں۔ اسی طرح اس کاروبار کی بعض شکلیں وہ ہیں جو حوالہ کے ذیل میں آتی ہیں۔ بعض شکلیں کفالہ کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں بھی بعض ناجائز پہلو پائے جاتے ہیں، لیکن ان کو چند معمولی جزوی ترامیم کے ذریعے آسانی سے شریعت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ بارہواں کام بینک یہ کرتے ہیں کہ رقوم کے تبادلے اور ترسیل کے کام کو آسان کر دیتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی کے ساتھ لین دین کرنا ہے مثلاً رقم اسلام آباد بھیجنی ہے تو آپ یہاں بینک میں جمع کروادیں۔اسی دن یا اگلے دن آپ کے عزیز کو اسلام آباد میں رقم مل جائے گی۔یہ ایک سہولت ہے جو آپ کو حاصل ہے۔ یہ بھی بہ ظاہر جائز ہی معلوم ہوتی ہے۔اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

۱۳۔آخری کام جو بینک اب تک کرتے رہے ہیں۔وہ تمویل المشاریع التجاریہ اور تمویل المشارع الصناعیۃ کا کام ہے۔ بینک مختلف صنعتی منصوبوں اور تجارتی کاروبار میں سرمایہ لگاتے ہیں اور یوں ملک کے کاروبار، تجارت یا صنعت کو فروغ دینے میں حصہ لیتے ہیں۔اگر یہ تمویل، مشارکہ، مضاربہ اور شریعت کے دوسرے احکام کے مطابق ہو تو اس کے مستحسن ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ ملک کی ترقی، صنعتوں کا قیام، عامۃ الناس کو روزگار کی فراہمی، مسلمانوں کی معاشی قوت اور اقتصادی خودمختاری کا حصول، یہ سب بہت اہم ذمے داریاں ہیں اور ان سب کی حیثیت مقاصد اجتماعیہ کی ہے۔ان میں سے بیشتر امور کا درجہ فرائض کفایہ کا ہے، جیسا کہ امام غزالی، علامہ ابن تیمیہ اور دوسرے متعدد ائمہ اسلام نے تصریح کی ہے۔

ان سب کاموں کی انجام دہی میں اگر بینک حصہ لیں اور شریعت کی احکام کے مطابق اپنا کام کریں تو اس کے پسندیدہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بلاشبہ یہ بہت اچھی چیز ہے، بلکہ اس کو شرعاً مندوب قرار دینا چاہئے اور مستحسن سمجھنا چاہئے۔لیکن افسوس یہ ہے کہ بینکوں کے ذریعے عام طور پر جو تمویل ہوتی ہے وہ سود کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جو اسلامی متبادل اب تک سوچے گئے ہیں ان پر بعض اسلامی بینکوں میں اب عمل درآمد ہونا شروع ہوا ہے۔ان میں سے بعض شکلوں کی طرف میں بعد میں آؤں گا۔

یہ سب وہ کام ہیں جو دنیا کے سب بینک کر رہے ہیں۔مسلم ممالک کے بینک بھی کر رہے ہیں، اور غیر مسلم ممالک کے بینک بھی کر رہے ہیں۔ان بینکوں کے ساتھ ساتھ ہر ملک میں ایک مرکزی بینک بھی ہوتا ہے جس کا کام تمام بینکوں کی نگرانی کا ہوتا ہے۔ اس مرکزی بینک کے مختلف جگہ مختلف نام ہیں۔امریکہ میں ریزرو بینک کہتے ہیں۔ برطانیہ میں بینک آف انگلینڈ کہتے ہیں۔ پاکستان میں اسٹیٹ بینک کہتے ہیں۔انڈیا میں ریزرو بینک آف انڈیا کہتے ہیں۔

یہ گویا حکومت کا مرکزی بینک ہے جو کئی دوسرے کام بھی کرتا ہے۔ان میں سے اکثر کام شرعاً جائز معلوم ہوتے ہیں۔ایک دوکام ناجائز ہیں جن کا متبادل سوچا جانا چاہئے اور سوچا گیا ہے۔

سب سے بڑا کام تو پاکستان کا اسٹیٹ بینک یعنی مرکزی بینک یہ کرتا ہے کہ یہ حکومت پاکستان کا بینک ہے۔حکومت پاکستان کی ساری رقم، سارا خزانہ اور سارا سرمایہ اسٹیٹ بینک کے پاس ہوتا ہے۔اسٹیٹ بینک اس سرمائے کا گویا امین ہے۔یہ حکومت پاکستان کا خزانہ ہے۔حکومت پاکستان اپنی بیشتر رقم اندرونی اور بیرونی کرنسی کی صورت میں اس بینک میں رکھتی ہے۔ابھی میں نے عرض کیا کہ پندرہ یا سترہ ارب ڈالرز زرمبادلہ کی جو رقم اس وقت (۲۰۰۴ء میں) حکومت پاکستان کے پاس ہے وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان ہی کے پاس محفوظ ہے۔اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے اس کو اپنے اکاؤنٹ کے طور پر اپنے مختلف غیر ملکی بینکوں میں امریکہ، برطانیہ وغیرہ میں رکھا ہوا ہے۔

دوسرا بڑا کام مرکزی بینک کا یہ ہوتا ہے کہ وہ حکومت کی طرف سے کاغذی کرنسی جاری کرتا ہے۔یعنی زر اعتباری جاری کرتا ہے۔نوٹ جتنے بھی جاری ہوتے ہیں وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی طرف سے جاری ہوتے ہیں۔ہر ملک کا مرکزی بینک ہی ملک کی کرنسی جاری کرتا ہے۔سعودی عرب میں وہاں کے مرکزی بینک کو موسسۃ النقد السعودی کہتے ہیں جو سعودی کرنسی جاری کرتا ہے۔سعودی عرب کا ایک اسٹیٹ بینک ایک پاکستانی ماہر معاشیات اور ماہر بینکاری نے قائم کیا تھا۔جو طویل عرصے اس کے سربراہ رہے۔مرحوم انور علی کا سعودی عرب میں بڑا احترام کیا جاتا ہے، ان کی مہارت کا آدمی پاکستان میں بھی شاید کوئی نہیں تھا۔انہوں نے اتنی بڑی اکانومی کو اس طرح مرتب اور منظم کیا۔اس سے پہلے سعودی عرب کی اکانوی مرتب و منظم نہیں تھی۔

لوگ بتاتے ہیں کہ سعودی عرب کے پہلے وزیر خزانہ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں شیخ سرور الصبان تھے۔ان کا انداز یہ تھا کہ وہ اپنے مکان کے باہر کھلی جگہ میں ایک چارپائی پر بیٹھے ہوتے تھے۔اور چارپائی کے نیچے ایک بہت بڑا صندوق ہوتا تھا۔جس میں سعودی عرب کا سرکاری فنڈ محفوظ ہوتا تھا۔اس صندوق میں بڑا تالا لگا ہوتا تھا۔اور ان کے کمر بند میں اس کی چابی بندھی ہوتی تھی۔جب کوئی سرکاری آدمی کسی ادائیگی کی سرکاری چٹ یا حکم نامہ لے کر آتا

تھا تو شیخ سرور الصبان کمر بند سے چابی نکال کر صندوق کھینچ کے اس کو کھولتے تھے، رقم کا لین دین کیا کرتے تھے اور پھر صندوق کو اسی طرح چارپائی کے نیچے رکھ دیا کرتے تھے۔ جو رقم آتی تھی وہ بھی اس میں رکھ دیا کرتے تھے۔

اس درجے کی معاشیات اور مالیات کو جناب انور علی نے اتنا منظم کر دیا کہ آج سعودی عرب کا مؤسسۃ النقد السعودی دنیا کے اسٹیٹ بینکوں میں بہت نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اور بہت منظم بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ ایک پاکستانی ماہر معاشیات کا کارنامہ ہے۔ جس کا سعودی بھی اعتراف کرتے ہیں۔

اسٹیٹ بینک کا تیسرا بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ بینکوں کا بینک کہلاتا ہے، یعنی بنک البنوک۔ بنک البنوک کے اعتبار سے اس کو دو تین اہم اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ ایک بڑا اختیار تو یہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر بینک کے پاس جتنی رقم ہے۔ جتنا سیولہ یعنی نقدی ہے۔ اس کا ایک مقررہ حصہ لازماً اسٹیٹ بینک میں جمع کروانا پڑتا ہے۔ سیولہ کی یہ مقدار بدلتی رہتی ہے: ۱۵ فیصد، ۲۰ فیصد، ۲۵ فیصد، بعض ملکوں میں ۳۵ بھی ہے، ۱۵ فیصد بھی ہے۔ بعض جگہ ۱۰ فیصد بھی ہے۔ لیکن ایک متعین حصہ ہر حال میں اسٹیٹ بینک کے پاس رکھنا ہوتا ہے۔ تاکہ اگر کسی وقت اگر کوئی بینک اچانک سیولہ کی کمی کا یعنی نقد رقم کی کمی کا شکار ہو جائے تو اسٹیٹ بینک سے جا کر بہ قدر ضرورت رقم لے سکے۔ اور اس ایمرجنسی میں یا ہنگامی حالت میں اپنی فوری ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس کے لئے قواعد وضوابط طے کئے جاتے ہیں۔ اسٹیٹ بینک قواعد وضوابط وضع کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کہتے ہیں Bank of the last resort یعنی آخری چارہ کار والا بینک، المقرض الاخیر، سب سے آخر میں جو قرضہ دینے والا ہے۔ کہیں سے اگر قرضہ نہ ملے تو پھر اسٹیٹ بینک سے بینک جا کر پیسے لے سکتا ہے، اسٹیٹ بینک آف پاکستان حکومت پاکستان کا خازن بھی ہے۔ اور ملک کی حدود کے اندر جتنے مقامی بینک ہیں ان سب کا کنٹرول، ان سب کی نگرانی، اور ان سب کی سربراہی ایک اعتبار سے اسٹیٹ بینک کرتا ہے۔

اسٹیٹ بینک کے قواعد کی پابندی تمام بینکوں کو لازماً کرنی پڑتی ہے۔ اسٹیٹ بینک کی ہدایات کی خلاف ورزی کوئی بینک نہیں کرسکتا۔ اسٹیٹ بینک جب تک اجازت نہ دے بینکاری کا کوئی کاروبار نہیں ہوسکتا، اگر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کسی بینک کا لائسنس منسوخ کر دے تو

اس بینک کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔اس کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑے گا۔

اس اعتبار سے اسٹیٹ بینک آف پاکستان یا کسی بھی ملک کا اسٹیٹ بینک انتہائی طاقت ور بینک ہوتا ہے۔اور ملک کی پوری معاشیات کی کامیابی کا دارومدار بڑی حد تک اسٹیٹ بینک یا مرکزی بینک کی کارکردگی، اصول پر کاربندی، احساس ذمے داری اور چوکسی کے ساتھ ساتھ آزادی، قوت وخود مختاری پر ہوتا ہے۔افسوس یہ ہے کہ پاکستان میں ایک زمانہ ایسا رہا خاص طور پر ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۹ء سے لے کر گزشتہ چند سال تک کہ اسٹیٹ بینک کے اختیارات کو سیاسی حکومتوں کے کارندوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔بینک سارے پہلے ہی سرکاری تھے۔اسٹیٹ بینک حکومت کے زیر اثر تھا۔جن لوگوں کو حکومت چاہتی تھی کہ قرضے مل جائیں ان کو قرضے مل جایا کرتے تھے۔جن کے قرضے حکومت چاہتی تھی کہ معاف کردیئے جائیں ان کے قرضے معاف کردیئے جاتے تھے۔چنانچہ بینکوں کی اربوں کھربوں روپے کی رقم ڈوب گئی۔سیاسی رشوت کے طور پر لوگوں کو قرضے دیئے گئے۔اوراس سیاسی رشوت کو آسان بنانے میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ذمے داروں نے بدعنوان سیاسی عناصر کا پورا پورا ساتھ دیا۔اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے اعلیٰ کارندوں کی ملازمتیں پختہ نہیں تھیں، وہ سب حکومت کی پسند وناپسند پر منحصر تھیں، اس لئے وہ حکمرانوں اور بدعنوانوں عناصر کے اشاروں پر چلنے پر مجبور تھے۔

اب الحمد للہ (۲۰۰۴ء میں) یہ صوت حال نہیں ہے۔اب صورت حال ذرا پہلے سے بہتر ہوئی ہے۔اب اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی خود مختاری میں ایک قانون کے ذریعے اضافہ کردیا گیا ہے۔اس قانون میں اس کے تمام حقوق، فرائض اور اختیارات متعین کردیئے گئے ہیں۔اس قانون کی رو سے اسٹیٹ بینک کے گورنر کو ہٹایا نہیں جاسکتا۔اسٹیٹ بینک کے گورنر کی ملازمت کے لئے ایک مدت مقرر ہے۔دو مرتبہ سے زیادہ وہ اپنی مدت پر مقرر نہیں کیا جاسکتا۔یعنی یہ نہ ہو کہ تیسری مدت کے لئے مقرر کئے جانے کی خاطر حکومت کے کارندوں کے ذاتی مفاد اور ان کی شخصی پسند اور ناپسند کے کام کرنا شروع کردے۔اس لئے اسٹیٹ بینک کے گورنر کو صرف دو مرتبہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔اس سے زیادہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس طرح کے قواعد اور بھی بہت سے ممالک میں ہوتے ہیں۔جن پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔دنیا کے متمدن ممالک اور ذمے دار حکومتوں میں ان قوانین کی خلاف ورزی کا تصور بھی

نہیں کیا جا سکتا۔ جن ملکوں کے اسٹیٹ بینک کم زور ہوتے ہیں وہاں کی معاشیات بھی کم زور ہو جاتی ہے اور افراتفری کا شکار رہتی ہے۔ جن ملکوں کے اسٹیٹ بینک مضبوط ہیں عام مشاہدہ یہ ہے کہ وہاں کی معاشیات بھی مضبوط ہوتی ہے اور پورے نظام کو اپنے کنٹرول میں لئے ہوئے ہوتی ہے۔

بینکاری کی اس ساری اہمیت کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ بینکاری، معاشیات اور مالیات کے پورے نظام کا ایک حصہ ہے۔ اگرچہ بینکاری پورے معاشی نظام کا ایک اہم حصہ ہے، لیکن بہرحال دوسرے بہت سے حصوں میں سے ایک حصہ ہی ہے۔ اسلامی معاشیات کے مکمل نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ پورے نظام کی اسلامی خطوط پر اصلاح کی جائے۔ پاکستان میں معاشی نظام کی اسلامی خطوط پر اصلاح کا کام نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے اور دوسرے ممالک کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تیزی اور سرعت سے اس کو کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں دو طرح کی معیشتیں چل رہی ہیں۔ ایک وہ ہے کہ جس کو دستاویزی معیشت کہتے ہیں Documented Economy ۔ دوسری وہ ہے جس کو غیر دستاویزی معیشت کہتے ہیں۔ اور Undocumented Economy دستاویزی معیشت یعنی Documented Economy سے مراد تو وہ لین دین، معیشت اور تجارت ہے جو باقاعدہ کھلے عام سرکاری طور پر، سرکاری قواعد وضوابط، اور دستاویزات اور بینکوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس کا ریکارڈ تو مکمل طور پر حکومت پاکستان کے پاس ہوتا ہے، اس کا پورا پورا ٹیکس بھی حکومت کو ملتا ہے۔ تاہم حکومت پاکستان کی معاشیات کا جو مجموعی حجم یعنی ٹوٹل والیوم ہے یعنی مالیات ومعیشت کی جو کل کیت ہے، یہ اس کا محض ایک حصہ ہے، کتنا بڑا حصہ ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اصل معیشت کا چالیس فیصد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۵۰ فیصد ہے۔ لیکن اس پر اکثر ماہرین کا اتفاق ہے کہ جتنی معاشیات ظاہری، دستاویزی اور Transparent یعنی شفاف ہے اتنا ہی حصہ وہ ہے جو سطح کے نیچے ہے اور غیر سرکاری معیشت کے طور پر چل رہا ہے۔ مثلاً غیر سرکاری ہنڈی کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اگر آپ سعودی عرب میں ملازمت کر رہے ہوں، یا کسی اور بیرونی ملک میں تجارت کے ذریعہ پیسہ کما رہے ہوں اور اپنے عزیزوں کو رقم بھیجنا چاہتے ہوں تو سرکاری نظام سے اگر آپ بھیجیں گے تو آپ کے

عزیزوں کورقم کے ملنے میں کم ازکم ایک ہفتہ لگے گا،اوراگر بڑی رقم ہے تو پوچھ گچھ کا الگ سامنا کرنا پڑے گا۔

لیکن لوگ بتاتے ہیں کہ اگر آپ کسی پٹھان بھائی سے ہنڈی کے ذریعے رقم منتقل کرائیں تو آپ کا کام بہت آسانی سے اور جلدی سے ہو جائے گا۔خلیج کے بہت سے شہروں میں، جدہ میں، مکہ مکرمہ میں ایسے کارندے ہر جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ان کے ذریعے بڑی سے بڑی رقمیں بہت جلد منتقل ہو جاتی ہیں۔آپ ان سے صرف یہ کہ دیں کہ خان صاحب ہمیں ایک کروڑ روپیہ لاہور یا ملتان بھیجنا ہے۔ایک گھنٹے میں آپ کے گھر سے فون آجائے گا کہ ایک کروڑ روپیہ مل گیا۔آپ رقم ادا کر دیجئے۔

بغیر کسی دستاویزی حساب کتاب کے محض اعتماد پر یہ سارا سلسلہ چل رہا ہے،اور اتنی بڑی اکانومی چل رہی ہے،اتنا بڑا کام چل رہا ہے اور نہ صرف پاکستان کے اندر چل رہا ہے بلکہ باہر بھی چل رہا ہے کہ جتنی اکانومی حکومت پاکستان کے سرکاری ریکارڈ کی رو سے ملک میں چل رہی ہے۔اتنی ہی یا اس سے بڑی اکانومی اور معیشت غیر سرکاری طور پر چل رہی ہے۔بعض ذمے دار لوگ کہتے ہیں۔یہ ماہرین فن کا بیان ہے۔میں اس فن کا آدمی نہیں ہوں،کہ پاکستان کی بقا اور تحفظ کو جس چیز نے ضمانت فراہم کر رکھی ہے وہ یہی غیر سرکاری معیشت ہے۔اس لئے کہ یہ حکومت کے کنٹرول میں زیادہ نہیں ہے۔حکومت اس میں زیادہ مداخلت اس لئے نہیں کر سکتی کہ یہ سارا معاملہ حکومت کے کنٹرول میں نہیں ہے۔حکومت کی رسائی وہاں تک نہیں ہے۔لیکن ملک کا نظام حکومتوں کی کمزوری اور نااہلی کے باوجود، بدعنوان حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ کے باوجود جو چل رہا ہے وہ دراصل اسی غیر سرکاری زیرزمین معیشت کی بنیاد پر چل رہا ہے۔

یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ پاکستان میں معیشت کی اسلامائزیشن نسبتاً آسان ہے وہ اس دوسرے حصے کی وجہ سے کہا ہے۔یہ دوسرا حصہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو مغربی تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔یہ سب سیدھے سادے عام پاکستانی مسلمان ہیں۔زیادہ تر ان میں ہمارے پٹھان بھائی ہیں،اور درمیانے درجے کے تاجر ہیں یا چھوٹے تاجر ہیں۔یہ طبقہ عموماً دین دار ہوتا ہے۔یہ طبقہ عموماً بے دین نہیں ہوتا۔یہ طبقہ مغربی تصورات سے

زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ اس طبقے کے لوگوں کو اگر تحریک وترغیب اور تعلیم وتبلیغ کے ذریعے قائل کیا جائے کہ وہ اپنے معاملات کو اسلامی احکام کے مطابق بنالیں، تو یہ مخلص اور دین دار طبقہ بہت آسانی سے اس پر آسکتا ہے۔ یہ مسئلہ تو اپنی جگہ رہے گا کہ یہ اکانومی ڈاکومینٹڈ ہونی چاہئے کہ نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن کم از کم ان کے اپنے کاروباروں کو یہ حضرات نسبتاً زیادہ آسانی سے شریعت کے مطابق بنائے جاسکتے ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ اگر ایک تحریک اور مہم ایسی چلائی جائے جس میں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کے ذریعے، چھوٹے چھوٹے اشتہاروں کے ذریعے، کیسٹوں کے ذریعے، مواعظ اور تقریروں کے ذریعے، تجارت کے ضروری احکام، قواعد وضوابط، لین دین کے طور طریقے اس طبقے کو بتائے جائیں تو یہ طبقہ آسانی سے، دوسروں کے مقابلے میں بہت جلد، بہت پہلے، ان کو قبول کرلیتا ہے۔ اور اپنے معاملات کو صحیح کرنے اور ان کو مکمل طور پر شریعت کے مطابق بنانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تاجروں کے بہت سے اجتماعات میں گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے اور میں نے کبھی بھی ایسا نہیں دیکھا کہ میں نے گفتگو کی ہو اور اس کا بہت مثبت اثر میں نے اسی وقت محسوس نہ کیا ہو۔

اسلامی معیشت کے قیام کے لئے اقدامات

پاکستان میں اسلامی معیشت کے قیام کے لئے کیا کیا اقدامات ناگزیر ہیں، ضروری تبدیلیوں کے لئے کیا کچھ کرنا ضروری ہے؟ یہ موضوع ایک بہت لمبی گفتگو کا متقاضی ہے۔ لیکن میں اختصار کے ساتھ ان اقدامات کا ذکر کرتا ہوں جو معیشت کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ بینکاری چوں کہ معیشت کا ایک بہت اہم شعبہ ہے۔ اس لئے بینکاری کے نظام میں اصلاح کے لئے سب سے پہلے کوششیں شروع کی گئیں۔ پاکستان میں بھی بینکاری کو ترجیح دی گئی۔ دوسرے ملکوں میں بھی بینکاری کی اصلاح پر سب سے پہلے توجہ دی گئی۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں اصلاح کے کام میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ پیش رفت دو اعتبار سے ہوئی ہے۔ ایک پیش رفت تو نظری اعتبار سے یہ ہوئی ہے کہ اسلامی معیشت اور بینکاری کے بارے میں بہت سے تصورات واضح ہوئے ہیں۔ اور بہت سی غلط فہمیاں یا الجھنیں جو آج سے ۵۰ سال پہلے یا ۷۰، ۸۰ سال پہلے پائی جاتی تھیں۔ وہ اب بہت حد تک دور ہوگئیں ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ بہت سے لوگوں کو یہی ماننے میں تامل تھا کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے کہ نہیں۔ بینکاری سے وابستہ بہت سے لوگوں کا اصرار تھا کہ بینک کا منافع یا انٹرسٹ ربا نہیں ہے۔ بعض بڑے بڑے لوگ، بڑے سے مراد وہ لوگ جن کا عامۃ الناس میں خاصا احترام اور اثر ورسوخ تھا۔ وہ یہ اصرار کرتے تھے کہ بینک انٹرسٹ ربا نہیں ہے۔ علامہ سید رشید رضا جیسے بڑے آدمی جنہوں نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی اور ہر اعتبار سے انتہائی قابل احترام اور مخلص لوگوں میں تھے۔ انہوں نے ایک پوری کتاب اس پر لکھ دی کہ بینک انٹرسٹ ربا نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی رائے کی تائید میں جو دلائل بیان کئے وہ اس قدر کمزور، رکیک اور واہی دلائل ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا آدمی اور اتنا جید انسان اتنی کمزور باتیں ربا کی تائید میں کہہ رہا ہے۔ خود ہمارے برصغیر ہی کے دو بڑے صاحب علم اور مخلص حضرات اسی غلط فہمی کا شکار

ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد جنہوں نے قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا اور ویسے بھی وہ ملک وملت کے لئے مخلص انسانوں میں سے تھے، وہ بینک انٹرسٹ کو ربا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ نہ صرف بینک انٹرسٹ کو ربا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے ذہن میں یہ بھی بیٹھ گیا تھا کہ چوں کہ احناف کا نقطۂ نظر ہے کہ لاربا بین الحربی والمسلم اس لئے ہندوستان میں سود کھانا اور سودی کاروبار کرنا جائز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ باقاعدہ سود پر رقم چلایا کرتے تھے۔ امکان یہ ہے کہ سے شروع شروع میں شاید ہندوؤں کو سود پر رقمیں دینے کا سلسلہ شروع کیا ہوگا۔ بعد میں بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ ہندوؤں کے علاوہ خود مسلمانوں کو بھی سود پر رقم دیا کرتے تھے۔ ہمارے ملک کے مشہور صحافی، ادیب اور شاعر مولانا ظفر علی خان نہ صرف اس غلط فہمی کا شکار ہوئے، بلکہ ایک زمانے میں سودخوری کے حق میں تحریک تک چلانے کو تیار ہوگئے۔

یہ غلط فہمی وہ تھی کہ جو آج سے سو سال پہلے، ستر اسی سال پہلے بہت عام تھی۔ لیکن اب الحمد اللہ اہل علم کی غالب ترین اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے اور حرام ہے، اس لئے اس کو ختم ہونا چاہئے۔ اس غرض کے لئے بینکاری کے نظام میں ضروری تبدیلی آنی چاہئے۔ چناں چہ مختلف مسلم ممالک میں بھی اور غیر مسلم ممالک میں بھی جہاں جہاں بلاسودی کاروبار کی طرف پیش رفت ہوئی ہے، وہ اسی بنیادی اصول کو مان کر ہوئی ہے کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے اور اس میں تبدیلی آنی چاہئے۔

گزشتہ پچاس سال کے دوران چوں کہ بہت زور و شور سے بلاسود بینکاری پر توجہ ہوئی، بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ بہت سے تصورات واضح ہوئے، اس لئے وہ لوگ اپنی آواز میں کم زور پڑ گئے جو بینک انٹرسٹ کو ربا نہیں کہتے تھے اور بینکوں کے اس ''منافع'' کو جائز آمدنی کی ایک شکل قرار دیا کرتے تھے۔ اس وقت جہاں تک میرے علم میں ہے دنیائے اسلام میں کوئی قابل ذکر عالم یا فقیہ سوائے موجودہ شیخ الازہر کے ایسا نہیں ہے جو بینک انٹرسٹ کو ربا نہ کہتا ہو۔ موجودہ شیخ الازہر سید محمد طنطاوی بینک انٹرسٹ کو ربا نہیں سمجھتے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بینک انٹرسٹ مضاربہ کی ایک جدید شکل ہے۔ لیکن ان کی کتاب میں نے پڑھی ہے، جس زمانے میں، میں سپریم کورٹ کے بینچ میں شامل تھا اور سود کا فیصلہ لکھا جا رہا تھا تو اس زمانے میں یہ ساری کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ ان لوگوں کی تحریریں جو بینک انٹریسٹ کو ربا

نہیں قرار دیے تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا، رشید رضا کی کتاب بھی دیکھی، شیخ الازہر کی بھی کتاب دیکھی۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کے وہ حصے جن میں ان دلائل کا جواب دیا گیا ہے ان کے لکھنے میں میں بھی شریک رہا ہوں۔ شیخ الازہر کے بارے میں میرا احسن ظن ابھی تک یہی ہے کہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ بینکنگ ہے کیا؟ اور بینک کیسے کام کرتے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کچھ لوگوں نے ایک دستاویز تیار کر کے دے دی جس میں ان کو بتایا گیا کہ بینک کا کام یہ ہوتا ہے اور اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اس دستاویز کی بنیاد پر اپنی رائے دے دی۔ خود انہوں نے وہ اقوال نقل کئے ہیں جو ان کو بتائے گئے اور ان کی بنیاد پر کہا ہے کہ بینک فلاں فلاں کام کرتا ہے۔ حال آں کہ بینک وہ کام نہیں کرتا۔ اس لئے میں شیخ الازہر کو ایک طرح سے اس فتوے سے بری الذمہ سمجھتا ہوں۔ ان کا اپنا میدان نہ فقہ ہے نہ معاشیات، ان کا اپنا میدان نہ بینکاری ہے نہ وہ ان معاملات کو خود براہ راست ماہرانہ انداز میں سمجھتے ہیں۔ ان کو جو چیز بتائی گئی اس کے مطابق انہوں نے فتویٰ دے دیا۔ اس فتوے پر خود مصر اور عرب دنیا میں بہت سی تنقیدیں ہوئیں اور عام طور پر عامۃ الناس نے اس فتوے کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ شیخ الازہر کے علاوہ آج کوئی اور قابل ذکر دینی یا علمی شخصیت ایسی نہیں ہے، جو بینک انٹرسٹ کو رِبا سمجھتی ہو۔ بعض متجدِ دین البتہ ہمارے ہاں بھی ہیں، اور جگہ بھی ہیں، جو اس بات کو دہراتے رہتے ہیں۔ لیکن عامۃ الناس میں ان کی بات کو کوئی پذیرائی ابھی تک حاصل نہیں ہوئی۔

بینکوں کے جن کاموں کی میں نے فہرست بتائی ہے ان میں سے کچھ کام تو وہ ہیں جو یقیناً جائز ہیں اور مسلمانوں میں ہمیشہ سے ہوتے رہے ہیں۔ کچھ کام وہ ہیں جو بیت المال کے ذریعے ہوا کرتے تھے۔ کچھ کام وہ ہیں جو انفرادی طور پر تاجر اور سرمایہ دار لوگ ذاتی حیثیت میں کیا کرتے تھے۔ جو کام ذاتی حیثیت میں جائز ہیں وہ اجتماعی حیثیت میں بھی جائز ہیں۔ جو کام ذاتی حیثیت میں حرام ہیں وہ اجتماعی حیثیت میں بھی حرام ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی کام مسلمان تاجر ذاتی حیثیت میں کیا کرتے تھے۔ اور آج اس کو ادارتی انداز میں، یعنی تنظیمی انداز میں کیا جائے، جماعتی حیثیت میں کیا جائے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔

بیت المال سے تجارت کے لئے قرضہ لئے جانے کی روایت روزِ اول سے چلی آرہی

ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے دو صاحب زادے ایک بار کوفے سے واپس آرہے تھے۔ بیت المال کے متولی نے ان سے کہا کہ بیت المال کی ایک رقم مدینہ منورہ میں امیرالمومنین تک پہنچا دیں۔ اس پر سیدنا عمر فاروق کے صاحب زادوں نے یہ کہا کہ اگر بہ طورِ امانت کے ہم اس رقم کو لے کر جائیں گے تو رقم زیادہ محفوظ نہ رہے گی۔ اس لئے کہ اگر یہ رقم راستے میں ضائع ہوگئی تو بیت المال کی رقم ضائع ہو جائے گی۔

اس لیے آپ اس رقم کو بہ طور قرض ہمیں دے دیں، جو ہمارے ذمہ واجب الادا رہے گا۔ ہم یہ رقم بہ طور قرض لے لیتے ہیں۔ مدینہ منورہ واپس جا کر کے بیت المال میں ادا کر دیں گے۔ انہوں نے اس رقم کو قرض شمار کیا تا کہ بیت المال کا حق محفوظ رہے۔ بیت المال کے نقصان کا امکان نہ رہے۔

چناں چہ انہوں نے اس رقم سے راستے میں تجارت کی، اور تجارت کرنے کے بعد جب مدینہ منورہ پہنچے تو بیت المال کی رقم والد گرامی کی خدمت میں پیش کی اور یہ بھی بتایا کہ ہم نے بیت المال سے قرضہ لیا تھا۔ اور یہ اصل رقم ہے اور یہ ہمیں نفع ہوا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے بڑے بڑے چوں نہیں کر سکتے تھے۔ صاحب زادوں کی کیا مجال تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ پوری رقم بیت المال میں جمع کرادو۔ چناں چہ انہوں نے خاموشی سے پوری رقم بہ شمول نفع بیت المال میں جمع کروادی۔ لیکن انہوں نے شکایت کی کہ ہم نے تو یہ رقم از خود قرض میں تبدیل کرائی تھی، ہمیں تو بہ طور امانت دی جارہی تھی۔ ہم نے بیت المال کے مفاد میں یا بیت المال کی مصلحت کی خاطر یہ چاہا تھا کہ یہ قرض شمار کی جائے۔ امیرالمومنین کا ارشاد تھا کہ کیا ہر شخص کو بیت المال سے قرضہ ملتا ہے؟ کیا امیرالمومنین کے بیٹوں کے علاوہ اوروں کے بیٹوں کو بھی بیت المال سے قرضہ ملتا ہے؟ اگر نہیں ملتا تو پھر امیرالمومنین کے بیٹوں کو بیت المال سے قرضے لینے کا کوئی حق نہیں۔

ان حضرات نے بعض دوسرے صحابہ کرام کو حکم بنایا۔ سیدنا علی ابن طالب سے کہا۔ پھر کچھ لوگوں نے امیرالمومنین سے عرض کیا کہ امیرالمومنین! اس کو آپ کم از کم مضاربہ قرار دے دیں، اور یہ سمجھ لیں کہ بیت المال نے دونوں حضرات کو مضاربے پر رقم دی تھی۔ جو نفع ہوا ہے اس کا آدھا حصہ ان کو دے دیں اور آدھا بیت المال کے لئے لے لیں۔ امیرالمومنین

نے نہ صرف اس کی اجازت دے دی بلکہ آئندہ کے لئے ہدایت کی کہ اگر کوئی شخص بیت المال سے رقم لے کر بیت المال کی شراکت یا سرمایہ کاری سے مضاربت کرنا چاہے تو اس کو بھی ان ہی شرائط پر رقم دی جائے گی۔ بیت المال سے اس کے بعد ہمیشہ کاروبار کرنے والوں کو رقم دی گئی، اس کی مثالیں ہر دور میں ملتی ہیں۔

جہاں تک بینکوں کی اس ذمے داری کا تعلق ہے کہ ایک کی رقم دوسرے کو ادا کردیں۔ یا ایک تاجر کا سامان دوسرے تاجر تک پہنچادیں، یا ایک تاجر کا قرضہ دوسرے تاجر کو ادا کردیں۔ یہ کام بھی نیا نہیں، اسلام سے پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ صحابہ کرام کے زمانے میں بھی ہوا کرتا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت زبیر ابن عوامؓ کی بہت بڑی تجارت تھی اور وہ لوگوں کی رقوم اپنے پاس بہ طور امانت بھی رکھا کرتے تھے، قرض کے طور پر بھی رکھا کرتے تھے اور لوگوں سے مضاربت کے طور پر بھی لیا کرتے تھے، مختلف حیثیتوں سے لوگوں کی رقوم ان کے پاس رہا کرتی تھیں۔ وہ لوگوں کے قرضے بھی ادا کردیا کرتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے بڑے پیمانے پر آیا جایا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ کے کسی آدمی کو کسی کی رقم، مثلاً شام کے کسی آدمی کو یا کسی تاجر کو ادا کرنی ہے، وہ یہ رقم مدینہ منورہ میں حضرت زبیرؓ کے لوگوں کو دے دیا کرتا تھا۔ اور حضرت زبیرؓ کی طرف سے وہ رقم شام میں متعلقہ قرض دار کو ادا کردی جاتی تھی۔

اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ حضرت زبیرؓ اس کام کا معاوضہ وصول کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے۔ اگر نہ کرتے ہوں جیسا کہ زیادہ امکان ہے تو یہ ان کا تقویٰ اور خدمت خلق تھی۔ اور اگر وہ اس خدمت کا معاوضہ وصول کرتے ہوں تو یہ شرعاً بالکل جائز چیز ہے۔ جس پر کوئی غبار یا اعتراض نہیں ہوسکتا۔

امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا کاروبار بھی بہت بڑا تھا۔ اور فقہائے اسلام میں جس کو کاروبار کا براہ راست اور بہت وسیع تجربہ تھا وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ تھے۔ ان کے بارے میں بھی تفصیلات میں یہ ملتا ہے کہ مضاربے پر ان کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں کی رقمیں مضاربے کی بنیاد پر ان کے کاروبار میں لگی ہوتی تھیں۔ ان کی اپنی بھی رقمیں لگی ہوتی تھیں۔ ان کی طرف سے تجارتی قافلے ان کا سامان، کپڑا وغیرہ شام سے اور مشرقی یورپ سے لایا کرتے تھے۔ اور ان کی تجارتی کوٹھیاں مختلف شہروں میں خاص طور پر کوفے میں قائم تھیں اور ان کے کارندے یہ

کام کیا کرتے تھے۔ ان میں بہت سے وہ کام بھی شامل تھے جو موجودہ دور میں بینک کرتے ہیں۔

اسی طرح مسلم کشتی بان اور جہاز ران بھی بہت سے ایسے کام کیا کرتے تھے جو آج کل بینک کرتے ہیں۔ اگر قدیم زمانے کے مسلم جہاز رانوں کی کتابیں پڑھیں۔ مثلاً ماجد البحری ایک شہور جہاز ران تھا۔ سلمان البحری بھی ایک مشہور جہاز ران تھا۔ عربوں کی جہاز رانی پر، مسلمانوں کی جہاز رانی پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ایک بڑی اچھی کتاب اردو میں حضرت علامہ سید سلمان ندوی کی ہے ''عربوں کی جہاز رانی''۔ اس طرح کی تحریروں میں بھی اس بات کے ضمناً اشارے ملتے ہیں کہ یہ تجارتی ملاح جب تجارتی سامان لے کر جایا کرتے تھے تو جہاں جہاں یہ تجارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ یا تجارتی و جہازی کمپنیاں چلایا کرتے تھے۔ وہاں ان کی حیثیت ایک موبائل بینک کی بھی ہوا کرتی تھی۔ مثلاً ایک بستی یا ایک بندرگاہ پر جا کر اترے، وہاں کے لوگوں سے مال لیا، ان کے جو پیسے واجب الادا ہوتے تھے وہ ادا کئے۔ جو مزید رقم لینی ہوتی تھی وہ رقم لی، سامان بھی خریدا اور آگے چلے گئے۔ رقوم کی منتقلی اور جگہ جگہ ادائیگیوں کے یہ کام جو آج کے دور میں بینک کرتے ہیں وہ اس زمانے میں تاجر یا ملاح کیا کرتے تھے۔

ان مثالوں سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ بینکوں کے بہت سے جائز کام اسلامی دور میں با قاعدگی سے ہوا کرتے تھے۔ اس کے احکام فقہ کی کتابوں میں مرتب ہوئے ہیں۔ علامہ ابن عابدین سے آپ سب واقف ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی کی کتاب ردّالمحتار سے فقہ حنفی کے طلبہ خوب واقف ہیں۔ اس کتاب میں بہت سے احکام دیئے گئے ہیں، جس میں تجارتی امور خاص طور پر بین الاقوامی تجارت کے احکام بھی ہیں۔

جب جدید یورپ سے مسلمانوں کی تجارت شروع ہوئی تو مسلمانوں کا یورپ کے تاجروں سے واسطہ پڑا۔ اس رابطے کے نتیجے میں تجارتی معاملات کی بعض نئی صورتیں سامنے آئیں۔ مثلاً بیمہ یا سیکورٹی کی ضرورت پیش آئی۔ اس کو فقہ کی کتابوں میں سوکرہ کہتے ہیں۔ سوکرہ کے احکام مرتب ہوئے۔ علامہ ابن عابدین نے بھی اس کتاب میں سوکرہ کے احکام بیان کئے ہیں۔ یہ تجارتی بیمے کی ایک ابتدائی صورت تھی جس سے مسلمان تاجروں کو

سابقہ پیش آیا۔

خلاصہ یہ کہ بین الاقوامی تجارت وہ چیز ہے جو مسلمانوں میں ہمیشہ سے متعارف رہی ہے۔فقہائے اسلام نے اس کے احکام مرتب کئے اور خود بڑے بڑے فقہائے کرام نے اس کاروبار میں حصہ لیا۔ جیسا کہ سیدنا فاروق اعظم کی مثال میں نے دی۔ یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی زندگی میں اتنا رچ بس گئی تھی اور ان کی زندگی کا اتنا حصہ بن گئی تھی کہ مسلمانوں میں جو قصہ گو اور کہانی نویس ہوتے تھے،ان کے قصوں میں اور کہانیوں میں بھی یہ بات موجود ہے۔ اگر آپ الف لیلہ پڑھیں۔ جو تین ضخیم جلدوں میں عربی ادب کی اچھی کتاب ہے۔ (زبان تو اس کی کبھی معیاری نہیں سمجھی گئی۔لیکن طلبہ کی ضروریات کے لئے اچھی ہے۔جب میں نے بچپن میں عربی نئی نئی پڑھی تو دلچسپی کی خاطر الف لیلہ پڑھی،اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان پڑھنے میں روانی پیدا ہوگئی۔اس طرح کی کتابیں پڑھنے سے روانی پیدا ہو جاتی ہے۔اس لئے کہ نوجوان قصے،کہانیاں دلچسپی سے پڑھتا ہے اور قصے کہانیوں کی وجہ سے آدمی اکتاتا نہیں۔) الف لیلہ کے قصے اردو میں بھی مشہور ہیں۔سندباد جہازی مختلف جگہ جہاز لے کر جاتا ہے۔ اور جب جہاز لے کر جاتا ہے تو وہاں کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ میں فلاں بندرگاہ پر اترا،یا فلاں شہر میں ٹھہرا تو میں نے جہاں اور بہت سے کام کئے،وہاں وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ میں نے فلاں،فلاں تاجر کی رقم جو پچھلے سفر میں تجارت کے لئے لی تھی اس کو ادا کی۔ جب میں پچھلی مرتبہ آیا تھا تو میں اس کا سامان تجارت لے کر گیا تھا۔ جو میں نے فلاں شخص کے سپرد کر دیا تھا،اس کا مجھے معاوضہ لینا تھا۔اور اس سے جو قیمت وصول کی تھی وہ اس کو ادا کرنی تھی۔ چناں چہ میں نے اس مالک کو قیمت بھی ادا کی۔اور اپنا معاوضہ بھی اس سے وصول کیا۔اور اس کے بعد میں آگے روانہ ہوگیا۔یہ محض کہانی ہے۔محض لٹریچر یا ادب ہے۔لیکن اس ادب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا یہ اتنا طے شدہ اور رائج الوقت طریقہ تھا کہ عام ادب میں،کہانیوں کی کتابوں میں اور سفرناموں تک میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔لہٰذا آج اگر بینکوں کے ذریعے اس کام کو کیا جائے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

[illegible] بینک جو اب قائم ہوں گے یا ہو رہے ہیں ان میں اور روایتی بینکوں میں متعدد

پہلوؤں سے فرق ہوگا، اور وہ فرق ہونا چاہئے۔ پہلا بڑا فرق تو یہ ہوگا کہ موجودہ بینک قرض اور غیر حقیقی زر کا کاروبار کرتے ہیں۔ غیر حقیقی زر سے میری مراد وہ زر ہے جس کی تفصیل محض کاغذ پر لکھی ہوئی ہے۔ جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ ایسی فرضی چیز ہے کہ اگر آپ کسی وقت رات کو بیٹھ کر اس پر غور کریں تو انسان خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ کسی وقت اگر اس بلبلے میں سوراخ ہوگیا، اور اس میں ہوا گھس گئی تو یہ سارا بلبلہ پانی کی طرح بیٹھ جائے گا۔ جیسا کہ ماضی میں بیٹھتا رہا ہے۔

میں ذرا اس کی تھوڑی سی تفصیل بیان کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں بینکوں کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے آپ ایک بینک چلا رہے ہیں۔ میں نے ایک لاکھ روپیہ آپ کے پاس جمع کروایا۔ اب آپ کے پاس جو اصل اور حقیقی رقم آئی ہے وہ ایک لاکھ روپے ہیں۔ یہ real money ہے۔ جو حقیقی زر ہے (واقعہ یہ ہے کہ جس کو زر حقیقی کہا جا رہا ہے وہ بھی زر حقیقی نہیں ہے، وہ بھی صرف کاغذی نوٹ ہیں۔ لیکن فرض کیجئے کہ یہ زر حقیقی ہی ہے، تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ آپ کے پاس زر حقیقی ہے) وہ ایک لاکھ روپے ہے۔ اب بینک نے وہ ایک لاکھ روپے پچاس پچاس ہزار روپے کر کے دو حضرات کو بہ طور قرض دے دیئے، اس لئے کہ بینک کا کام ہی بنیادی طور پر یہ ہے کہ وہ اپنے پاس جمع شدہ رقوم کو آگے قرض پر دے دیتا ہے۔ ان دونوں حضرات نے جنہوں نے یہ پچاس پچاس ہزار روپیہ بینک سے قرض لیا ہے، آپ ہی کے ہاں اکاؤنٹ کھول کے پچاس پچاس ہزار روپے رکھوا دیئے۔ اب آپ کے کاغذات میں آپ کے پاس دو لاکھ روپے ہو گئے۔ ایک لاکھ وہ جو میں نے رکھوایا اور پچاس پچاس ہزار وہ جو ان دو حضرات نے رکھوایا۔ اب یہ دو لاکھ روپے آپ نے مزید چار آدمیوں کو پچاس پچاس ہزار روپے کی صورت میں قرض دے دیئے اب آپ کے کاغذات کی رو سے آپ کے پاس چار لاکھ ہو گئے۔ اس طرح سے بینک کے اکاؤنٹ کے حساب سے دولت کا حجم اور کاروبار بڑھتا جاتا ہے اور جو اصل رقم اس کے پیچھے ہوتی ہے، بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اگر وہ آدمی اپنی اصل رقم یعنی ایک لاکھ روپے نکال لے اور بقیہ لوگوں میں سے بھی کچھ لوگ نقد رقم کا مطالبہ کرنے آ جائیں تو سارا کاروبار غبارے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

یہ جو مشرق بعید میں چند سال قبل ہوا تھا، جو جگہ جگہ ہوتا رہتا ہے کہ اچانک سارا کاروبار

بیٹھ جاتا ہے اور کچھ نہیں پتہ چلتا کہ یہ کیا ہوا۔ جو پچھلے ۱۹۹۸ء، ۹۹، ۹۷ء کے سالوں میں ملائیشیاء، انڈونیشیا اور فار ایسٹ میں ہوا جو Eesteren Tigers کہلاتے جاتے تھے۔ یہ سارے Easteren tigers اس خطرے کا شکار ہو گئے کہ یہ Eastern بلیاں بن جائیں یہ Eastern گیدڑ بن جائیں، Tigers سے یہ ایک دم گیدڑ بن گئے! اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ بہ ظاہر یہی تھی کہ بعض مغربی سرمایہ داروں نے، غیر مسلم سرمایہ داروں نے، مسلم ممالک میں خاص طور پر ملائیشیا، انڈونیشیا میں بہت بڑی رقمیں بینکوں میں لگا دیں، اور بینکوں نے اس کا چھ گنا، آٹھ گنا، دس گنا، بیس گنا قرضے جاری کر کے کاروبار میں لگا دیئے۔ اب انہوں نے اپنی اصل رقم واپس لے لی۔ جب اصل رقم واپس لے لی تو جیسے کسی عمارت کی بنیاد نیچے سے کھینچ لی جائے تو عمارت گر جاتی ہے، اسی طرح وہ ساری عمارت گر گئی۔ یہ دنیا کے بینکوں میں آئے دن ہوتا ہے۔ یہ اسلامی بینکوں میں نہیں ہوگا۔

اسلامی بینک جب بھی کاروبار کریں گے تو وہ زرِ حقیقی کی بنیاد پر کریں گے، یا جس کو اصل یا موجودات کہتے ہیں۔ (پتہ نہیں، اسٹ asset کا آج کل رائج الوقت اردو ترجمہ کیا ہے)۔ بینکوں کے کاروباری معاملات real asset کی بنیاد پر ہوا کریں گے۔ اس کے نتیجے میں کوئی اسٹ، یعنی حقیقی جائیداد وجود میں آئے گی۔ کوئی حقیقی زر وجود میں آئے گا۔ یا تو کوئی انڈسٹری لگے گی جو زمین پر کھڑی ہوگی، مدرسوں کی اصطلاح میں خارج میں موجود ہوگی، یا اس سے کوئی تجارت شروع ہوگی وہ تجارت آپ کو نظر آئے گی۔ وہاں سامان تجارت رکھا جائے گا۔ یا اس کے نتیجے میں کوئی خدمت یا منفعت فراہم ہوگی۔ بجلی فراہم کرنی ہے تو آپ کو بجلی لگی ہوئی نظر آئے گی۔ آپ کو یہاں سے میر پور خاص تک سڑک بنانی ہے تو لوگوں کو سڑک بنی ہوئی نظر آئے گی، یعنی ایک حقیقی خدمت یا حقیقی جائیداد اس کے نتیجے میں وجود میں آئے گی۔ یا کوئی اور زرِ حقیقی اس کے نتیجے میں آپ کے پاس موجود ہوگا۔ یعنی اسلامی بینک اور روایتی بینک میں یا مغربی بینک میں پہلا بنیادی فرق یہ ہوگا کہ مغربی اور روایتی بینک زرِ غیر حقیقی اور قرضوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ اسلامی بینک زرِ حقیقی اور موجودات کے کاروبار کے بنیاد پر اپنے معاملات کو چلائیں گے۔ Feat Money یا محض کاغذی دولت کی بنیاد پر کاروبار کو نہیں چلائیں گے۔

روایتی بینکوں اور اسلامی بینکوں میں دوسرا فرق یہ ہوگا کہ اسلامی بینک قرض کے بجائے

واقعی اور حقیقی شراکت کی بنیاد پر چلیں گے۔آج کل صورت حال یہ ہے کہ روایتی بینکوں کے سارے معاملات قرضوں کی بنیاد پر چلتے ہیں۔جس کو کاروبار کرنا ہو،تجارت کرنی ہو،انڈسٹری لگانی ہو،صنعت لگانی ہو وہ بینک سے قرضہ لے کر یہ کام کرتا ہے۔اور اس قرضے کی بنیاد پر ہی اس کا کام آگے بڑھتا ہے۔اس قرض کی رقم سے صنعت کار صنعت لگاتا ہے۔وہ صنعت چلے یا نہ چلے، بلکہ صنعت کار سرے سے صنعت لگائے یا نہ لگائے،اس صنعت میں آگ لگ جائے، کاروبار ناکام ہو جائے، بینک کو ان تمام آفات ونتائج سے کوئی غرض نہیں ہوتی، بینک کو ہر حال میں اپنی اصل رقم سود کے ساتھ واپس لینی ہوتی ہے اور وہ ہر حال میں قرضہ لینے والا واپس کرتا ہے۔اسلامی بینکوں کا معاملہ یہ نہیں ہوگا۔اسلامی بینک براہ راست کاروبار میں شریک ہوگا اور کاروبار کی کام یابی یا ناکامی سے براہ راست بینک کا منافع یا بینک کا مفاد وابستہ ہوگا۔بینک کی مصلحت براہ راست اس سے وابستہ ہوگی۔اور بنک اس کاروبار میں حصہ لے گا،تاکہ اس کاروبار کو چلانے میں مدد فراہم کرے اور اس کاروبار کو کامیاب بنائے۔

اس اصول پر عمل درآمد کا نتیجہ واضح طور پر یہ نکلے گا کہ اسلامی بینکوں اور دوسرے بینکوں کے رویے اور طرز عمل میں فرق پیدا ہوگا۔آج کے روایتی بینک یا مغربی بینک کسی کاروبار یا سرمایہ کاری کی کام یابی یا ناکامی سے غرض نہیں رکھتے۔ان کو اس سے بھی بحث نہیں ہوتی کہ یہ کاروبار کام یاب ہو رہا ہے کہ نہیں ہو رہا، یہ انڈسٹری بیمار انڈسٹری ہے کہ صحت مند انڈسٹری ہے، بیمار صنعت ہے یا صحت مند صنعت ہے۔ان کو ہر صورت میں اپنی رقم سے دل چسپی ہوتی ہے۔اسلامی بینک کی دل چسپی ہر وقت اور ہر لمحے اس سے ہوگی کہ جس انڈسٹری یا سرمائے میں اس نے پیسہ لگایا ہے۔جس تجارت کی اس نے تمویل کی ہے وہ تجارت، وہ صنعت اور وہ انڈسٹری کام یابی کے ساتھ چلے اور کام یابی کے ساتھ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچے۔

اس کے نتیجے میں جیسے جیسے اسلامی بینکنگ کا کام پھیلتا جائے گا اتنے ہی تسلسل،توازن اور تناسب کے ساتھ اثاثے ظہور میں آتے جائیں گے، جائیداد وجود میں آتی جائے گی۔تجارت اور کاروبار کا حجم بڑھتا جائے گا۔اور حقیقی رقم وجود میں آتی جائے گی۔اگر یہ تین چیزیں اضافہ ہوتی جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی بینک کامیاب ہیں۔

یا تو اصل رقم میں اضافہ ہو، حقیقی رقم میں اضافہ ہو۔یا حقیقی جائیداد اور اثاثوں میں،

مشینری میں یا کسی بھی ایسی چیز میں اضافہ جو خارجی طور پر ہو یعنی Tangible ہو یعنی ایک وجود حقیقی رکھتی ہو اس میں اضافہ ہو، یا اس کے نتیجے میں حقیقی سروسز اور خدمات لوگوں کو فراہم ہوں اور وہ خدمات دست یاب ہو جائیں، مثلاً لوگوں کو علاج کی سہولت مل گئی، اسپتال بن گیا ہے۔ لوگوں کو علاج کی سہولت فراہم ہو رہی ہے۔ بجلی کی سہولت ہو گی، اور لوگوں کو بجلی فراہم ہو گئی۔ سڑک بن گئی ہے تو سڑک فراہم ہو گئی ہے۔ یہ ساری سروسز کی قسمیں ہیں۔ ان سارے کاموں کے لئے مختلف تدابیر اور تجاویز اور Mode of Financing یا وسائل استثمار، یا طرق استثمار پچھلے پچاس سالوں میں فقہائے اسلام نے، دور جدید کے اہلِ علم اور ماہرینِ معاشیات نے سوچ کر تجویز کئے ہیں۔ اور ان کی تفصیلات بھی تیار کی ہیں۔

لیکن استثمار یا سرمایہ کاری کے ان طریقوں پر گفتگو سے قبل میں ایک بات خاص طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سب حضرات کا تعلق اہل افتا سے ہے۔ آپ فقہ اور شریعت کو مجھ سے بہت زیادہ سمجھتے اور جانتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ میری بات غلط ہو تو اس کی تردید کر دیجئے گا۔ صحیح ہے تو اتفاق فرمایئے گا۔

عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کاروبار کے جائز ہونے یا جائز قرار دیئے جانے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ مشارکہ، اجارہ یا مضاربہ وغیرہ کی ان شرائط کے سو فیصد مطابق ہو جو مثلاً ہدایہ میں لکھی ہیں، یا مثلاً کسی اور فقہ یا فتاویٰ کی کتاب میں ملتی ہیں یا بیع سلم اور استصناع کے ان احکام کے مطابق ہوں جو فقہ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہوں۔ ہر کاروبار کو ان میں سے لازماً کسی ایک اصطلاح کی طے شدہ اور متعین حدود میں (جس کو انگریزی میں Tight Jacket کہتے ہیں) آنا چاہئے۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایسا ضروری نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی شریعت نے باقاعدہ Lay down نہیں کی۔ یعنی اس میں سے کسی چیز کا شریعت نے حکم نہیں دیا۔ قرآن پاک میں کہیں نہیں آیا کہ اے مسلمانو! مشارکہ یا مضاربہ کرو۔ مضاربہ کی تائید یا حرمت میں کوئی آیت بھی قرآن پاک میں موجود نہیں ہے۔ کھینچ تان کے یضربون فی الارض سے بعض فقہا یہ نکالتے ہیں کہ چوں کہ ضرب کے معنی سفر کرنے کے بھی آئے ہیں اور مضاربہ میں سفر ہوتا ہے۔ لہٰذا ضرب میں مضاربہ بھی شامل ہے۔ مسلمانوں کے ہر کام کا قرآن پاک سے تعلق قائم

کرنا بلاشبہ اچھی بات ہے، لیکن اس سے یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہونی چاہئے کہ شریعت نے کاروبار کے چند محدود طریقے ہی متعین کئے ہیں۔ جن کے علاوہ ہر قسم کا کاروبار حرام ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مشارکہ یا مضاربہ وغیرہ کی تائید یا حرمت میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو سنت قولی یا فعلی سے ثابت ہوتی ہو۔ یہ چیزیں سنت تقریری سے ثابت ہیں۔ صحابہ کرام اسلام سے پہلے سے بہت سے کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہ مضاربہ بھی کیا کرتے تھے، مشارکہ بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب کا مضاربہ ہوا کرتا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے بہت پہلے حضرت خدیجہؓ کے مال میں مضاربہ کے لئے تشریف لے گئے۔ مضاربہ کا طریقہ اسلام سے پہلے سے عربوں میں رائج تھا۔ مضاربہ میں جن طریقوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے خلاف پایا۔ اس کی آپ نے اصلاح فرمادی اور منع فرمادیا کہ یہ کام نہ کرو۔ جو چیزیں جائز تھیں ان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ وہ جائز اور باقی رہیں۔

اس لئے میری گزارش علمائے کرام سے یہ ہوتی ہے کہ مضاربہ، مشارکہ کے احکام تو اپنی جگہ ہیں اور بینکوں کے لئے اس کی تفصیلات بھی واضح کردی گئیں۔ میں ابھی بتاتا ہوں کہ کیا کیا گیا ہے۔ یہ سب اپنی جگہ، لیکن اگر ان طریقوں کے علاوہ کوئی نیا طریقہ آج کل کوئی بینک دریافت کرتا ہے، یا آپ حضرات دریافت کرتے ہیں جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں نہ ملتی ہوں، مثلاً وہ کوئی ایسا کاروبار ہو کہ اس کو نہ آپ مضاربہ کہہ سکتے ہوں، نہ مشارکہ کہہ سکتے ہوں، نہ روایتی طریقوں میں سے اس کو کسی طریقے کے مطابق کہہ سکتے ہوں، نہ وہ کسی خاص متعین فقہی اصطلاح کے ذیل میں آتا ہو، تو محض اس وجہ سے وہ کاروبار ناجائز نہیں ہو جائے گا کہ وہ کسی متعین فقہی اصطلاح کے ذیل میں نہیں آتا۔ ایسا کاروبار اس کے باوجود جائز ہوسکتا ہے، اگر اس میں کوئی ناجائز عنصر شامل نہ ہو، مثلاً اس میں ربا نہ پایا جاتا ہو۔ اس میں غرر نہ پایا جاتا ہو۔ اس میں قمار نہ پایا جاتا ہو۔ اس میں بیع الدین بالدین نہ پایا جاتا ہو۔ اس میں اجتماع الصفقتین فی صفقۃ نہ پایا جاتا ہو۔ غرض جو بھی شریعت کے محرمات ہیں، جن کی تعداد پندرہ کے قریب ہے وہ محرمات اس طریقے میں نہ پائے جاتے ہوں تو وہ کاروبار بھی جائز ہوگا، اور اس کو جائز ہونا چاہئے۔ اسلامی بینکوں کو اسے اختیار کرنے کی اجازت بھی دینی چاہئے اور ترغیب بھی

دینی چاہئے۔

ایسا ابھی اس لئے نہیں ہو رہا کہ اسلامی بینکوں نے ابھی تک اس طرح مکمل کام کا آغاز نہیں کیا جس طرح اس کام کا آغاز ہونا چاہئے تھا۔کسی کاروبار کی کوئی نئی شکل وضع کرنا یہ میرا، آپ کا یا کسی فقیہہ یا مفتی کا کام نہیں ہے، یہ فقہ وشریعت کے کسی طالب علم کا کام نہیں ہے۔یہ تو ایک تاجر کا کام ہے۔ایک ایسے تاجر کا جو تجارت کر رہا ہے، جو بازار میں بیٹھا ہے۔وہ سوچ سکتا ہے کہ کاروبار کے نئے نئے طریقے کون کون سے ہوسکتے ہیں۔یہ سارے فقہی طریقے جن کے احکام فقہ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں یہ طریقے فقہائے اسلام نے تجویز نہیں کئے تھے۔ مشارکہ پہلے سے چلا آرہا تھا۔مضاربہ پہلے سے چلا آرہا تھا۔فقہائے کرام نے جب دیکھا کہ یہ کاروبار کا ایک طریقہ ہے تو انہوں نے شریعت کے احکام کو سامنے رکھ کے مضاربہ کی شرائط مدوّن کردیں، یا مشارکہ کی شرائط واضح کردیں۔اسی طرح سے جتنی کاروبار کی شکلیں تھیں ان سب کی شرائط طے کردیں۔

آج اگر مغربی دنیا میں کاروبار کی کوئی نئی شکل ہمارے سامنے آئے۔یا کسی مشرقی ملک مثلاً چین میں کوئی نیا تجارتی طریقہ جنم لے یا پاکستان کے تجارتی حلقوں میں کوئی طریقہ رواج پا جائے تو اگر وہ فقہ کے ان روایتی طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کے سو فیصد مطابق نہ بھی ہو۔لیکن شریعت کے احکام سے متعارض نہ ہو، تو وہ بھی کاروبار کی ایک جائز شکل ہوگی اور آج کے فقہائے اسلام کی یہ ذمے داری ہوگی کہ شریعت کی ہدایات کی روشنی میں اس کے احکام کو وضع کریں۔اور اس کی ضروری تفصیلات کو شریعت کے احکام کی روشنی میں واضح کردیں تاکہ لوگوں کے لئے اس کاروبار کو اختیار کر کے اس کے اسلامی تقاضوں پر عمل کرنا آسان ہوجائے۔

ایک اعتبار سے پورا فقہ المعاملات کاروبار کا دستور العمل، اور تجارت کا قانون ہے۔فقہ اسلامی کے جس شعبہ کو فقہا فقہ المعاملات کہتے ہیں، اس میں تمام عقود سے بھی بحث ہوتی ہے۔عقودِ معاوضہ سے بھی بحث ہوتی ہے، عقودِ مشارکہ سے بھی ہوتی ہے۔عقودِ کفالہ، حوالہ اور رہن پر گفتگو بھی ہوتی ہے۔عقودِ توثق پر بھی بات ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ساری شکلیں تجارت اور کاروبار ہی کی شکلیں ہیں۔اس اعتبار سے فقہی ابواب میں سے فقہ المعاملات میں جتنی بھی شکلیں عقود کی بیان ہوئی ہیں وہ ساری کی ساری سود کے متبادل کے طور پر استعمال ہوسکتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

قرآن مجید نے ایک جملے میں سود کا متبادل بیان کر دیا

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲)

اور اللہ نے بیع (خرید و فروخت) کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔

تجارت اور بیع کی جتنی شکلیں ہیں وہ ساری جائز ہیں اور ربا کی جتنی ممکنہ صورتیں ہیں وہ ساری ناجائز ہیں۔شریعت نے بیع کی کوئی متعین شکل وضع نہیں کی۔ ہر وہ لین دین جس میں شریعت کے احکام کی پابندی کی گئی ہو۔(اور شریعت کے احکام واضح اور معلوم ہیں۔) وہ بیع ہی کی ایک جائز قسم ہے، اس لئے بیع کی یہ نئی شکل بھی جائز ہوگی۔لین دین کی ہر نئی شکل جو شریعت کے احکام سے متصادم نہ ہو وہ جائز ہوگی۔لہٰذا ٹریڈنگ کی ساری شکلیں، وہ مشارکہ یا مضاربہ یا سلم یا استصناع یا اجارہ یا مضاربہ وغیرہ ہو یا ان کے علاوہ بھی اور شکلیں ہوں۔ان سب سے بہ راہ راست بینکاری اور تجارت کے میدان میں کام لیا جا سکتا ہے۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ بینک تحویل قروض کرتا ہے۔تحویلِ قروض ہی کے لئے فقہائے اسلام نے کفالہ اور حوالہ کے احکام مرتب کئے تھے۔کفالہ اور حوالہ کے احکام کو دورِ جدید کے تقاضے سامنے رکھ کر آج کل کی زبان میں بڑی آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔اور بعض اداروں نے یہ کام کیا بھی ہے۔ ان سب احکام کو آج کل کی زبان میں اور آج کل کی اصطلاحات میں بیان کر دیا جائے تو اس طبقے کے لئے ان کے مطابق معاملات کو چلانا آسان ہو جائے گا۔

اصل میں مشکل صرف اصطلاحات اور زبان کی ہے۔اصطلاحات اور زبان ایک تو وہ ہے جو آپ حضرات اور آپ جیسے دوسرے علماء سمجھتے ہیں۔درس گاہوں میں بیٹھ کے، دارالافتاء میں بیٹھ کے آپ اس کو سمجھ لیتے ہیں، یہ ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری اور شامی کی زبان ہے۔ایک زبان وہ ہے جو کراچی میں بولٹن مارکیٹ اور جونا مارکیٹ کا تاجر اور کاروباری طبقہ سمجھتا ہے۔وہ آپ کی زبان نہیں سمجھتا، آپ اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اب ایک شکل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنے وسائل اور اختیارات دے کہ آپ ان سب کو بلا کے زبردستی مدرسے میں بٹھائیں، نورالایضاح سے لے کر ہدایہ اور ردّالمحتار تک،

۲۔البقرہ:۲۷۵

اول سے لے کر آخر تک، ساری فقہ اور صحاح ستہ اور بیضاوی اور کشاف تک سارا دین پڑھا دیں۔ یہ ہمارے اور آپ کے بس میں نہیں ہے۔ تاجر آپ کے پاس آئے گا ہی نہیں، آپ کے کہنے سے تو بالکل نہیں آئے گا۔ دوسری ممکنہ اور آسان شکل یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ (سب نہیں) تھوڑا سا وقت لگا کے ان کی زبان اور اصطلاحات کو سمجھ لیں۔ اور ان کی اصطلاحات اور محاورے کو سمجھنے کے بعد شریعت کے احکام کو ان کی زبان میں بیان کر دیں۔ امام محمد کے بارے میں لکھا ہے۔اور آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کا ایک حصہ بازار میں گزارا کرتے تھے اور بازار میں بیٹھ کر یہ سمجھا کرتے تھے کہ کاروبار کس طرح ہوتا ہے۔ تاجر کاروبار کیسے کرتے ہیں؟ تجارت اور لین دین کی شکلیں کیا ہیں۔ بازار میں وہ یہ وقت صرف اس لئے صرف کیا کرتے تھے کہ وہ بازار کے معاملات کے احکام کو مرتب کرسکیں۔

میری ذاتی رائے میں امام محمد بن حسن شیبانی کا یہ بازار میں بیٹھنا سو فیصد عبادت تھی۔وہ سارے لمحات جو انہوں نے بازار میں بیٹھ کے گزارے وہ اتنے ہی قابل رشک ہیں جتنے وہ لمحات تھے جب وہ کتاب الاصل لکھ رہے تھے، یا کتاب السیر الکبیر یا کتاب الجامع الصغیر لکھ رہے تھے۔اس لئے کہ اسی فقہی ذخیرے کو بہتر انداز میں لکھنے کے لئے وہ بازار میں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔

کل مجھ سے ایک طالب علم پوچھ رہے تھے کہ میرے والد شدید اصرار کرتے ہیں کہ ایک دو گھنٹے روزانہ دوکان میں بیٹھا کرو اور کچھ وقت خاندانی کاروبار کے لئے دیا کرو، وہ عزیز اس باب میں متأمل تھے۔ میں نے کہا بھئی کہ آپ امام محمد کے اتباع کی نیت کریں۔امام محمد بھی بازار میں یہ سمجھ کر بیٹھا کرتے تھے اور اس نیت سے بیٹھتے تھے کہ تجارت کے احکام کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔آپ اس نیت سے بیٹھیں گے تو امام محمد کو جیسا اجر ملا تھا۔ ویسا ہی آپ کو ملے گا۔اور آپ تجارت کے شرعی احکام کو آج کل کی زبان میں زیادہ بہتر انداز میں بیان کرسکیں گے۔

یہ جو تجارت کے فقہی احکام ہیں ان کو صرف دور جدید کے محاورے، زبان اور اصطلاح میں بیان کرنے کی ضرورت ہے۔مضاربہ مشارکہ کے جو احکام ہیں وہ انتہائی عقلی، انتہائی منطقی اور عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سارے احکام اجتہادی ہیں۔ ان میں جو منصوص احکام ہیں وہ بہت تھوڑے ہیں۔ چند احکام ہیں جو نص کی بنیاد پر ہیں، دو یا

تین بنیادی اصول ہوں گے۔ باقی سارے کے سارے احکام اجتہادی ہیں۔اور ان اجتہادی احکام کی بنیاد اس پر ہے کہ عدل وانصاف قائم ہو،لوگوں کے کاروبار میں جائز بنیادوں پر کام کیا جائے اور قرآن حکیم کا یہ اصول پیش نظر رہے:

اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِنْکُمْ (۳)

سوائے اس کے کہ آپس کی رضامندی سے تجارت ہو۔

حوالہ کا اصول کارفرما ہے،اور جن چیزوں سے شریعت نے منع کردیا ہے وہ چیزیں نہ کی جائیں۔اور جن چیزوں کی پابندی کا حکم دیا ہے ان کی پابندی کی جائے۔

اسلامی بینکاری کے لئے جو متبادل آئیڈیل طریقے ہیں وہ تو مضاربہ اور مشارکہ ہی ہیں۔مضاربہ اور مشارکہ کے بارے میں عام طور سے یہ تاثر ہے۔کم از کم ہمارے ہاں بینکاری سے وابستہ لوگ یہی کہتے ہیں کہ ان دونوں کو فوری طور پر اور مکمل طور پر اختیار کرنا بہت مشکل ہے اور اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔کیا رکاوٹیں ہیں؟ میں ابھی ان کی طرف بھی آتا ہوں، بعض رکاوٹیں واقعی بڑی رکاوٹیں ہیں لیکن ان کو حل کیا جاسکتا ہے۔بعض رکاوٹیں محض فرضی یا وہمی ہیں جن کی حیثیت بہانے سے زیادہ نہیں۔خوئے بد ہوتو بہانہ بسیار ہو ہی جاتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ مضاربہ اور مشارکہ کو اختیار کرنے کے راستے میں کوئی حقیقی رکاوٹ نہیں ہے۔یہ صرف نیت اور عزیمت کا معاملہ ہے۔جس دن عزیمت پختہ ہوگئی اور نیت صاف ہوگئی وہ رکاوٹ، رکاوٹ نہیں رہے گی۔اور جب تک وہ رکاوٹ باقی نظر آرہی ہے وہ اسی وقت تک ہے جب تک نیت صاف نہیں ہے۔

اسلامی بینکاری کے متبادل طریقوں میں سے کچھ تو وہ ہیں جو بعض خاص منصوبوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔مثال کے طور پر سلم اور استصناع کا معاملہ ہے۔سلم اور استصناع سے انڈسٹری میں بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔جو لوگ انڈسٹری سے وابستہ ہیں،خاص طور پر چھوٹی انڈسٹری کے لوگ ہیں یا درمیانی انڈسٹری لگانے والے ہیں۔وہ سلم اور استصناع کی بنیاد پر بہت آسانی سے کام کرسکتے ہیں۔

استصناع کی اصطلاح فقہائے مالکیہ استعمال کرتے ہیں۔فقہائے حنفیہ یہ اصطلاح

۳۔النساء:۲۹

استعمال نہیں کرتے۔ علمائے احناف کے خیال میں استصناع سلم ہی کی ایک شکل ہے۔ بہ ہر حال وہ سلم کی ایک شکل قرار دی جائے یا الگ کوئی قسم سمجھی جائے، لیکن اتفاق سب کا اسی پر ہے کہ وہ جائز ہے۔لہٰذا درمیانے درجے کی پیداوار کے لئے بہت آسانی سے سلم اور استصناع کے طریقے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

پاکستان چوں کہ زرعی ملک ہے اس لئے یہاں مزارعہ اور مساقاہ کے طریقے بھی اختیار کئے جا سکتے ہیں۔اور بڑی بڑی زرعی زمینوں کو مزارعہ اور مساقاہ کی بنیاد پر آسانی سے قابل کاشت بنایا جا سکتا ہے۔اور ایگریکلچر بینک اس کام کے لیے سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں۔آج سے کافی عرصے پہلے بینک آف پنجاب کے بعض حضرات نے مجھ سے کہا تھا۔(شاید میری تحریریں کچھ انہوں نے پڑھی تھیں یا میری کوئی تقریر شائع ہوئی تھی۔جس میں مزارعہ اور مساقاہ کا ذکر بھی تھا۔) بہ ہر حال انہوں نے مجھ سے کہا کہ مزارعہ اور مساقاہ سے بینک کیسے کام لے سکتا ہے؟ ان کے کہنے پر میں نے ایک چھوٹی سی دستاویز مرتب کی تھی کہ زمینوں کی آبادکاری کے لئے سرمایہ کاری مزارعہ اور مساقاہ کی بنیاد پر کیسے ہو سکتی ہے۔میرا خیال ہے ایسا ہونا بہت آسان ہے۔کم از کم بینک آف پنجاب کے اُن ذمے دار حضرات نے اس وقت (یہ بات کوئی آج سے بارہ تیرہ سال پہلے کی ہے) یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ یہ جو تم نے لکھا ہے یہ قابل عمل نہیں ہے، یا مشکل ہے۔لیکن ہمارے ملک میں حالات تیزی کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔لوگوں کی رائے یا رجحان میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔اس لئے شاید جو لوگ دلچسپی رکھتے ہوں گے وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہوں گے، اس لئے ان معاملات میں کوئی زیادہ کارروائی نہیں ہوئی ہو یا کوئی اور وجہ ہوئی ہوگی۔

ایک اور طریقہ جس پر آج کل بہت زیادہ عملدرآمد ہو رہا ہے۔اور جس پر زیادہ وسیع پیمانے پر عمل درآمد سے وہ نتائج سامنے نہیں آ رہے ہیں جو اسلامی بینکاری کے نتیجے میں سامنے آنے چاہئیں۔وہ مرابحہ کا طریقہ ہے۔مرابحہ کی تجویز سرمایہ کاری کے ایک طریقہ کار کے طور پر سب سے پہلے کس نے دی؟ میں نہیں جانتا۔لیکن میرے خیال میں جس نے بھی دی اس نے نیک نیتی ہی سے دی ہوگی۔میں خدانخواستہ کسی کی نیت پر شک نہیں کرتا، لیکن یہ طریقہ کار نامناسب، بلکہ غلط ثابت ہوا۔اور جیسے انگریزی میں کہتے ہیں Counter Productive

ثابت ہوا۔اس کا نتیجہ مثبت نکلنے کے بہ جائے منفی نکل رہا ہے۔اس وقت مرابحہ کے نام پر جو کاروبار ہورہا ہے وہ بیشتر اسلامی بینکوں کا اگر ۹۹ نہیں تو ۸۰۔۹۰ فیصد تو ضرور ہے۔آج بینکوں کے ۸۰۔۹۰ فیصد کام مرابحہ کی بنیاد پر ہورہے ہیں اور مرابحہ کی جو بھی شکل رائج ہے وہ اپنے چند ظواہر سے قطع نظر اپنی روح اور نتائج کے اعتبار سے روایتی سودی کاروبار سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔اسی کی وجہ سے اسلامی بینکوں کے معاملات پر اعتراض یا سوالیہ نشان کی گنجایش بھی محسوس ہوتی ہے۔

مرابحہ کی رائج الوقت شکل یہ ہے کہ فرض کیجئے آپ ایک انڈسٹری لگانا چاہتے ہیں۔آپ کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔آپ کسی بینک کے پاس جاتے ہیں۔اس کو بتاتے ہیں کہ آپ جرمنی سے ایک کروڑ روپے کی مالیت کی فلاں قسم کی مشینری منگوانا چاہتے ہیں۔بینک آپ کو مشینری منگوادیتا ہے،اب مرابحہ کے مقررہ اصولوں کے تحت ہونا تو یہ چاہئے کہ بینک اپنی ذمے داری پر،اپنے ذرائع اور وسائل سے آپ کی مطلوبہ مشینری درآمد کرے اور مشینری پاکستان منگوانے کے بعد آپ کو مرابحہ پر فروخت کردے۔بینک کے لئے شرعاً یہ جائز ہوگا کہ اگر وہ مشینری اس کو ایک کروڑ روپے میں پڑی ہے تو وہ آپ کو مثلاً دس فیصد نفع کے ساتھ ایک کروڑ دس لاکھ روپے میں فروخت کردے۔اگر چہ یہ اسلامی سرمایہ کاری کا کوئی آئیڈیل طریقہ نہیں ہے۔لیکن اگر مرابحہ کی بنیاد پر سرمایہ کاری کا کوئی طریقہ ہوسکتا تھا تو وہ یہی تھا۔مرابحہ کا یہی جائز طریقہ تھا۔لیکن اس پر بینکوں سے سے وابستہ بعض حضرات نے اعتراض کیا اور اعتراض کرنے والوں نے اس اعتراض کو سن لیا اور اس کو جائز اعتراض سمجھا۔بینکوں نے یہ اعتراض کیا ہمارے پاس اس طرح کی تجارت کے لئے مہارت یا Expertise دستیاب نہیں ہے ہم یہ کام بہ ہراہ راست نہیں کرسکتے۔مثلاً کسی بینک کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جو انڈسٹری آپ جرمنی سے منگوارہے ہیں کیا وہ واقعی جرمنی کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی؟ کیا وہ اپنے فیلڈ میں بہترین انڈسٹری ہے؟ کیا وہی مشین جس کی متوقع خریدار نے نشان دہی کی ہے اس کام کے لئے بہترین مشین ہے؟ کیا اس مشینری کا جرمنی ہی سے منگوانا ضروری ہے؟ کیا جس Specification یا جن شرائط کی حامل انڈسٹری آپ منگوارہے ہیں کیا اس کام کے لئے درکار مشینری میں یہی شرائط ہونی چاہئیں؟

یہ سب امور طے کرنا بڑی مہارت کا کام ہے۔آج کل اس قسم کے کاموں میں بڑی نازک اور پیچیدہ مہارتیں درکار ہوتی ہیں۔چوں کہ بینکوں کے پاس اس طرح کے کام کی کوئی مہارت نہیں ہے اس لیئے بینکاروں کا کہنا تھا کہ وہ یہ کام بہ ہراہ راست نہیں کرسکتے۔اس کا ایک حیلہ تجویز کیا گیا جو میرے خیال میں بہت کم زور حیلہ تھا،اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ وہ افسوس ناک حیلہ ہے۔وہ حیلہ یہ تھا کہ علمائے کرام نے کہا کہ جو شخص یہ مشینری منگوا رہا ہے بینک اسی کو اس کام کے لئے اپنا وکیل بنادیں۔وہ بینک کے وکیل کے طور پر مطلوبہ مشینری باہر سے منگوالے۔

یہ محض کان ادھر سے پکڑنے والی بات تھی۔یہ ایک حیلہ تھا۔چلئے اگر اس حیلے کی بھی پوری پابندی ہوئی ہوتی تو بھی غنیمت تھا۔بینک نے آپ کو وکیل بنادیا۔اب بینک نے آپ کو ایک کروڑ روپیہ دے دیا اور آپ بینک کے وکیل کے طور پر وہ انڈسٹری جرمنی سے منگوا رہے ہیں۔اب جو اصول بتایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ جب انڈسٹری منگوالیں تو پھر یہاں منگوانے کے بعد آپ اس کو یہاں بینک کے حوالے کردیں۔جب آپ وہ مشینری بینک کے حوالے کردیں گے۔اس وقت تک،گویا جرمنی سے منگوانے سے لے کر یہاں پہنچنے تک راستے کے سارے مراحل اور خطرات بینک کے ذمے ہوں گے۔ظاہر ہے کہ وہ مشینری بحری جہاز سے آئے گی،پہنچنے میں تین مہینے لگیں گے،چار مہینے لگیں گے،پھر وہ کب تک کراچی کی بندرگاہ پر پڑی رہے گی۔وہاں بندرگاہ کی فیس بینک کو دینی ہوگی۔تاخیر کا تاوان بینک کو دینا ہوگا۔یہ سارا خرچہ بینک ادا کرے گا۔اس لئے کہ مشینری ابھی تک بینک کے Risk میں ہے۔اور اس کا ضمان یا تاوان سب بینک کے ذمے ہوگا۔جب بینک اسے وصول کرلے گا اور اپنے قبضے میں لے لے گا تب وکیل کی وکالت ختم ہوجائے گی۔پھر وصول کرنے کے بعد اب بہ طور بائع اور مشتری کے آپ کا اور بینک کا نیا رشتہ اور تعلق قائم ہوگا اور بینک بہ طور بائع کے وہ مشینری آپ کو بیچ دے گا۔آپ بہ طور مشتری کے اسے خرید لیں گے۔اس موقع پر بینک اپنا نفع لے گا۔ایک کروڑ پر جو خرچ آتا ہے وہ رکھے گا۔اور اس کاروبار میں جو اپنا منافع رکھنا چاہئے۔پانچ فیصد دس فیصد وہ رکھ لے گا۔

اگر یہ ساری چیزیں سو فیصد اس طریقہ کار کے مطابق ہوں جب بھی یہ اسلامی بینکاری کا

کوئی آئیڈیل یا مثالی متبادل نہیں ہے۔ یہ محض ایک حیلہ تھا۔ جو بعض لوگوں نے تجویز کیا اور بینکوں کے اس اصرار یا تامل کی وجہ سے کہ ہم بہ ہراہ راست کاروبار میں حصہ نہیں لے سکتے۔اس حیلے کی ضرورت پڑی، جس کی وجہ سے بعض حضرات کو اسلامی بینکاری پر اعتراض کا موقع ملا۔

بینکوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ اور ہے۔وہ رکاوٹ کسی حد تک بڑی اہم ہے۔ لیکن اگر حکومتیں (اور یہ ''اگر'' یہ بہت بڑا اگر، ہے) اس پر توجہ دیں اور ذمے داری سے کام کرنا چاہیں تو اس رکاوٹ کو دور کیا جاسکتا ہے۔

آج کل دنیا میں جتنے بینک بھی کام کررہے ہیں، وہ ایک بین الاقوامی نظام سے پوری طرح وابستہ اور مربوط ہیں، بلکہ اس میں جکڑے ہوئے ہیں، جب تک بینک اس نظام سے پوری طرح مربوط نہ ہوں بینک کام نہیں کرسکتے۔اندرون ملک آپ ایک چھوٹی بستی میں، کسی گاؤں میں بینک کے نام سے کوئی ادارہ یا مرکز بنالیں، اور اس کے ذریعے بستی کے لوگوں کے لئے بینکاری کی محدود سہولتیں فراہم کریں تو یہ تو شاید ہوسکتا ہے۔لیکن اگر آپ ملکی یا بین الاقوامی سطح پر کوئی کاروبار یا تجارت کررہے ہوں۔ایل سی کھول رہے ہوں، دوسرے بڑے بڑے بینکوں سے لین دین کررہے ہوں۔مثلاً باہر کے بینک سے یہاں کا بینک رقم کا تبادلہ کرنا چاہتا ہو، یا مثلاً جرمنی کے بینک سے لین دین کے ذریعے کوئی مشینری منگوانا چاہتا ہو۔تو اسے بین الاقوامی بینکنگ کے نظام اور نیٹ ورک کا حصہ بننا پڑے گا۔اگر یہ بینک بین الاقوامی بینکنگ کے نیٹ ورک کا حصہ نہیں ہوگا تو کسی غیر ملک کوکوئی بینک اس سے تعاون نہیں کرے گا۔جرمنی کے بینک کو کیسے بھروسہ ہوگا جس کی بنیاد پر وہ اتنی بڑی اور قیمتی انڈسٹری خرید کر بھیج دے، اس کو کیسے اور کس بنیاد پر یہ اعتماد پیدا ہوگا کہ یہاں کا مقامی بینک واقعی رقم ادا بھی کردے گا یا نہیں کرے گا۔

اس لئے بینکاری کا کام صحیح خطوط پر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بینکنگ کے انٹرنیشنل نیٹ ورک سے وابستگی قائم رکھی جائے، اس وابستگی کے لئے ضروری ہے کہ بین الاقوامی بینکاری کا جو نظام ہے اس کو آپ مانتے ہوں اور اس کی شرائط پر عمل کرنے کو تیار ہوں، بین الاقوامی بینکنگ کے نظام میں بینک کی تعریف یہ ہے کہ وہ ادارہ جو زر کا کاروبار کرتا ہو اور

قرضے کا لین دین کرتا ہو، وہ بینک کہلاتا ہے۔ اگر آپ خود خرید وفروخت شروع کردیں گے تو آپ بینک کی تعریف میں نہیں آئیں گے۔ پھر بین الاقوامی بینکنگ میں آپ کے لئے رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ پھر آپ کی بینکنگ چلے گی نہیں۔

یہ ایک واقعی اور حقیقی مشکل ہے، جو بینکوں کو درپیش ہے۔ اس مشکل بلکہ شکایت کا سدباب کرنے کے لئے بعض لوگوں نے تجویز کیا کہ بینک اس طرح کے معاملات میں مرابحہ کرلیا کریں۔ بینک براہ راست تو کوئی مشینری نہیں خرید رہا ہے، نہ خود کسی کاروبار میں شریک ہے۔ خرید وفروخت کا کام تو (بینک کے وکیل کے طور پر) کوئی اور کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ فرد خرید وفروخت کرسکتا ہے، بینک اس کو صرف رقم دے رہا ہے۔ ہوسکتا ہے واقعی یہ کوئی یعنی عذر ہو۔ لیکن میرے خیال میں یہ کوئی عذر نہیں تھا۔ اگر دنیائے اسلام کی چند حکومتیں مل کر بین الاقوامی مالیاتی اداروں، مالیاتی تنظیموں اور بینکوں سے بات کریں تو مجھے آج بھی یقین ہے کہ اس کا اثر ہوگا۔ اگر حکومت پاکستان، انڈونیشیاء، ملائیشیاء، سعودی عرب، ایران اور کویت مل کر بات کریں، ان کے پاس اتنا بڑا سرمایہ ہے اور اتنی بڑی رقم ہے کہ بین الاقوامی بینکاری کا نظام ان کی بات سننے پر مجبور ہوگا، اس لیے کہ وہ اتنے بڑے سرمائے کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ جو ادارہ کاروبار ہی کرنے کے لئے بیٹھا ہے۔ جس کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ سرمائے کو کھینچے۔ وہ اتنے بڑے سرمائے کو اپنی رسائی سے باہر رکھنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوسکتا۔

اس لئے خود مغربی دنیا کے تجارتی مفاد میں ہے کہ وہ آپ کی بات کو سنیں اور آپ کی بات کو وزن دیں۔ لیکن چوں کہ خود ہمارے ہاں حکومتوں کو، حکمرانوں کو اس پر شرح صدر نہیں ہے، ان کو خود اس میں تامل ہے اور اگر وہ کچھ کرتے بھی ہیں تو ایک وقتی اقدام، بلکہ دفع الوقتی کے طور پر کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس مسئلے کو سنجیدگی سے نہیں اٹھایا، اس کو بین الاقوامی سطح پر میری معلومات کی حد تک کسی مسلم حکومت نے ٹیک اپ نہیں کیا۔ اگر وہ اس مسئلے کو اٹھاتے اور کسی اونچی سطح پر بات کرتے تو شاید یہ مسئلہ حل کیا جاسکتا تھا۔

جو بات ابھی میں نے عرض کی تھی۔ میں اس کی طرف دوبارہ توجہ دلاتا ہوں کہ کاروبار کی وہ شکلیں جو شریعت سے متعارض نہ ہوں، چاہے وہ مشارکہ، مضاربہ کی ٹائیٹ جیکٹ، یا اس آہنی فریم میں نہ آتی ہوں۔ لیکن شرعاً قابل اعتراض نہ ہوں وہ بھی اسی طرح اسلامی ہیں جیسے

اجارہ، سلم یا استصناع وغیرہ۔ ان کو بھی اسلامی بینکنگ کو اختیار کرنا چاہئے اور ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ آج کل امریکہ میں، یورپ میں اور دنیا کے بہت سے علاقوں میں کاروبار کی دو شکلیں بڑی تیزی کے ساتھ اُبھر رہی ہیں اور یہ پچھلے چالیس پچاس سال میں زیادہ تیزی سے ابھری ہیں، اس سے پہلے ان کا زیادہ رواج نہیں تھا۔

ان دو طریقوں میں سے ایک کو Venture Cap کہتے ہیں۔ Venture Capital تقریباً نوے فیصد وہی چیز ہے جس کو ہم مضاربہ کہتے ہیں۔ وینچر کیپٹل میں سرمایہ لگانے والے کچھ سرمایہ کار ہوتے ہیں۔ جن کو وہ سلیپنگ پارٹنر کہتے ہیں۔ وہ سرمایہ دے کر اپنے گھر جا کر بیٹھ جاتے ہیں، گویا سو جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو Interpreneur کہلاتے ہیں جس کو آپ مضارب کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو عملاً کاروبار کرتے ہیں اور اس سرمائے کو کاروبار میں لگاتے ہیں۔ اور سال کے سال یا مقررہ مدت کے بعد نفع فریقین میں طے شدہ شرح سے تقسیم ہو جاتا ہے۔ یوں گھر بیٹھے شریک کو اس کا حصہ ملتا رہتا ہے۔ اس کے احکام مختلف ملکوں میں مختلف ہیں۔ بعض ممالک میں رائج اس کی تفصیلات میں نے پڑھی ہیں۔ مجھے ان تفصیلات میں اور مضاربہ کے احکام میں زیادہ فرق معلوم نہیں ہوا۔ تھوڑی سی ردوبدل اور تھوڑی سی ترمیم سے اُس کو اسلامی احکام کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ردوبدل نعوذ باللہ شریعت میں نہیں۔ بلکہ Venture Capital کے جو احکام ہیں ان میں ہوگا۔ یوں اس نظام میں تھوڑی سی ترمیم سے اس کو مضاربہ کے احکام کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن فرض کریں کہ وینچر کیپٹل میں یہ ترامیم نہ کی جا سکتی ہوں تو یہ دیکھنا کافی ہوگا کہ Venture Capital میں کوئی چیز شریعت سے براہِ راست متعارض تو نہیں ہے۔ کیا Venture Capital میں ربا پایا جاتا ہے۔ کیا Venture Capital میں غرر پایا جاتا ہے؟ کیا Venture Capital میں قمار کی آمیزش تو نہیں ہے؟ کیا Venture Capital میں بیع الدین بالدین ہوتا ہے؟ کیا اس میں لا تبع ما لیس عندك کے اصول کی پابندی ہو رہی ہے؟

اس طرح کے بارہ پندرہ احکام کو آپ دیکھ لیں۔ اگر وینچر کیپٹل کے کسی قابل عمل نظام میں ان احکام کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے، اور شریعت کے کسی اصول یا حکم کی خلاف

ورزی نہیں ہے۔ظلم نہیں ہے،استحصال بے جا نہیں ہے،تو پھر Venture Capital بھی اسی طرح کا اسلامی طریقہ ہے جس طرح مضاربہ ہے۔جن اصولوں کی بنیاد پر فقہائے کرام نے مضاربہ کو اسلامی طریقہ قرار دیا ان ہی اصولوں کی بنیاد پر وینچر کیپٹل کو اسلامی طریقہ قرار دیا جاسکتا ہے۔جاہلیت کے زمانہ سے رائج مضاربہ کے طریقہ کار کو جو پہلے سے چلا آرہا تھا۔فقہا نے ضروری ردّ و بدل اور مناسب ترمیم سے اسلامی بنالیا۔ہم بھی اسی طرح Venture Capital کو اسلامی بنا سکتے ہیں۔

اس نقطہ نظر سے جائزہ لے کر کام شروع کیا جائے تو ان شاء اللہ یہ تجربہ بہت جلد کامیاب ہوگا۔اور پھر ایک وقت ایسا آئے گا۔کہ جب Venture Capital سے لوگ مانوس ہوجائیں گے۔اور مانوس ہوجانے کے بعد جب وہ چل پڑے تو آپ آسانی سے اسے مضاربہ کے حدود میں بھی لا سکتے ہیں۔وہ مضاربہ کی حدود میں آ بھی جائے گا۔

یہ پوری گزارش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم مضاربہ کی بات کرتے ہیں۔بینکوں سے بات ہوتی ہے کہ آپ مضاربہ کی بنیاد پر کام کریں تو بینکاری کے ماہرین متعدد مشکلات اور عذر بیان کرتے ہیں۔بینک ایک عذر تو یہ بیان کرتا ہے کہ ہمارے پاس مہارتیں نہیں ہیں۔لہٰذا ہم کسی ایسے معاملے میں پیسہ نہیں لگا سکتے جس کی مہارت ہمارے ہاتھ میں نہ ہو۔اور نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہو۔تو ہم نفع کے بجائے نقصان کا خطرہ کیسے مول لے سکتے ہیں،خاص طور پر کسی ایسے معاملے میں جس کے ہم ماہر نہیں ہیں۔

اس کا جواب میں ابھی عرض کرتا ہوں۔دوسرا وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر اصول یہ ہو کہ الربح علی ماشرطا والوضیعۃ علی قدر المالین تو مال تو سارا ہم نے لگایا ہے۔اصل رب المال تو ہم ہیں۔سرمایہ تو سارا کا سارا ہمارا ہے جو ان رقوم پر مبنی ہے جو لوگوں کی بچتوں کی صورت میں ہمارے پاس جمع ہے،یہ سب رقوم ہمیں لوگوں کو دینا ہیں۔تو اگر وضیعہ ساری کی ساری ہمارے ذمے آتی ہے تو پاکستان میں یہ خطرہ بڑا شدید ہے کہ ہر کاروبار کرنے والا یہ ثابت کردے گا کہ میرے کاروبار میں نقصان ہوگیا۔ہمارے ملک میں اس بات کا خاصا امکان موجود ہے کہ قرضہ لینے والے یا سرمایہ لینے والے نوے فیصد لوگ بینکوں کو اپنے کاروبار میں گھاٹا دکھا کر فارغ ہوجائیں گے اور عام لوگوں اور بینکوں کا سرمایہ لے کر بھاگ جائیں گے۔یہ بات بھی

بڑی وزنی ہے۔اور پاکستان کے حالات اور ماضی کے تجربات کے اعتبار سے ایسی بے بنیاد بھی نہیں ہے۔ یہاں اس کا خاصا امکان موجود ہے۔

لیکن میں بینکوں سے یہ پوچھتا رہا کہ بھئی یہ بتائیے کہ کیا صرف پاکستان کا تاجر دھوکے باز ہوتا ہے؟ یا دنیا کے ہر ملک کا تاجر دھوکے بازی کرسکتا ہے؟ دھوکے باز تو دنیا کے ہر ملک کا تاجر ہوسکتا ہے۔ ہر انسان کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوسکتا ہے کہ غلط بیانی کے ذریعے، غلط حسابات کے ذریعے دوسرے کا مال دبالے۔آخر امریکہ میں، برطانیہ میں، یورپ میں Venture Capital میں روپیہ لگانے والے سرمایہ کاروں کے سرمائے کو محفوظ رکھنے کا کیا طریقہ ہے؟ جو سلیپنگ پارٹنرز ہیں وہ لاکھوں انسان ہیں اور پورے ملک میں پھیلے ہوتے ہیں۔ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے ۱۹۹۷ء میں غالباً یا ۹۸ء کے لگ بھگ میں نے یہ معلومات Venture Capital کے بارے میں جمع کی تھیں۔ امریکہ میں اس وقت ۳۵ بلین ڈالرز Venture Capital میں لگا ہوا تھا۔ ۳۵ ارب کو آپ ساٹھ سے ضرب دیں، کتنے کھرب بنے گا؟ پاکستان کے پورے بجٹ سے زیادہ بنے گا۔ ہمارے ٹوٹل سالانہ بجٹ سے زیادہ وہ رقم بنے گی جو امریکہ میں Venture Capital میں لگی ہوئی ہے۔

اتنی بڑی رقم جو غیر مسلموں نے کسی اسلامی جذبے سے نہیں دی، کسی مذہبی یا اخلاقی محرک کے تحت نہیں دی۔انہیں تو پتہ ہی نہیں کہ Venture Capital ہمارے مضاربہ سے ملتی جلتی چیز ہے۔انہوں نے تو اتنی بڑی رقم ایک کاروبار کے طور پر لگائی تھی۔آخر وہاں حکومت امریکہ نے یا امریکہ کے کاروباری اداروں کو کنٹرول کرنے والے اداروں نے اس کاروبار کی نگرانی اور مانیٹرنگ کا کیا طریقہ کار سوچا ہے؟ کون سے قوانین وضع کئے ہیں۔اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ ان سلیپنگ پارٹنرز کا سرمایہ محفوظ رہے وہاں کون کون سے اقدامات کئے گئے ہیں۔وہاں اس امر کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں کہ جو کاروبار کرنے والے ہیں وہ کاغذات اور دستاویزات میں نقصان دکھا کر پیسہ لے کر نہ بھاگ جائیں۔اس غرض کے لئے وہاں طریقۂ کار جو انہوں نے طے رکھا ہے اس کو سامنے رکھئے۔سامنے رکھنے کے بعد اس کو دیکھ لیں کہ وہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔اگر وہ احکام شریعت کے مطابق ہیں تو بسم اللہ، کام شروع کر دیجئے۔اگر نگرانی کا یہ نظام آپ کی رائے میں بالفرض شریعت کے مطابق نہیں ہے تو

میں نے کہا مجھے دیجئے میں اس کو شریعت کے مطابق بنادوں گا، اس کو آپ اختیار کرلیں۔لیکن ہمارے یہاں اس طرح کی تبدیلیوں، بالخصوص اسلامی بنیادوں پر تبدیلیوں کے لئے کوئی سنجیدگی سے آمادہ نہیں ہوتا۔یہ بات میں کہتا رہتا ہوں، آئندہ بھی کہتا رہوں گا۔اور جب تک موقع ملے گا اس بات کو میں دہراتا رہوں گا۔

دوسری بات جو بینک کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس وہ مہارتیں نہیں ہیں جن سے کام لے کر ہم مضاربہ یا مشارکہ وغیرہ کی بنیاد پر کام کرسکیں۔ یہ بات بھی بہ ظاہر بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔لیکن دراصل میں اس عذر کو عذرِ لنگ ہی سمجھتا ہوں۔میرے نزدیک یہ محض ایک بہانہ ہے۔

پاکستان میں جو سرمایہ کاری ہورہی ہے۔اس کے بارے میں میں نے ۱۹۹۹ء میں کچھ معلومات جمع کروائی تھیں۔اس کوشش کے نتیجے میں عجیب وغریب اور اہم معلومات حاصل ہوئیں۔پاکستان میں اس وقت جو ٹوٹل اکاؤنٹ ہولڈر تھے، آج سے چارسال یا پانچ سال پہلے، ان کی تعداد دو کروڑ سے کچھ زائد تھی۔دو کروڑ سے زائد اکاؤنٹ ہولڈرز تھے۔ایک آدمی کے کئی اکاؤنٹ بھی ہوں گے، اس لئے اصل تعداد اس سے کم ہوگی۔لیکن ٹوٹل اکاؤنٹ دو کروڑ سے زائد تھے۔ان دو کروڑ حسابات میں جو سرمایہ رکھا ہوا تھا۔اس کی مقدار اس وقت مجھے زبانی یاد نہیں آرہی، بہت زیادہ تھی۔ اگر مجھے صحیح یاد ہے تو غالبًا ایک ہزار بارہ ارب روپے کی رقم تھی۔ایک ہزار بارہ ارب روپے کا سرمایہ اس وقت پاکستان کے بڑے بڑے بینکوں کے پاس موجود تھا۔اس سرمائے سے جو لوگ بڑی بڑی رقمیں بہ طور قرض لے رہے تھے۔جن کو اس سرمائے کا اسی فیصد قرض دیا جارہا تھا۔ان کی تعداد چارسو کے لگ بھگ تھی۔پاکستان میں چارسو آدمی دو کروڑ انسانوں کی بچتوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔یہ بات اس وقت میرے سامنے آئی۔میں نے کہا! اچھا! اب یہ تحقیق کریں کہ یہ جو چارسو آدمی قرضہ لے رہے ہیں یہ کون حضرات ہیں اور اس قرضے کا کیا کرتے ہیں۔میں نے کہا ان کے بارے میں معلومات جمع کی جائیں کہ یہ اس قرضہ کو کہاں کہاں استعمال کررہے ہیں۔

اس رقم کو ہم نے بریک ڈاؤن کروایا، اس کو الگ الگ اجزا میں تقسیم کروایا تو یہ پتہ چلا کہ اس سرمائے کا بڑا حصہ، ایک ہزار بارہ ارب روپے کے سرمائے کا بڑا حصہ، نوے فیصد کے

قریب کا حصہ، بارہ قسم کی انڈسٹریز میں استعمال ہوتا ہے۔کیمیکلز میں، ٹیکسٹائلز میں، ایگریکلچر سے متعلق انڈسٹری میں مثلاً کھاد وغیرہ میں۔غرض ٹوٹل بارہ قسم کی انڈسٹریز ہیں جو پاکستان میں چلتی ہیں۔اوراس میں یہ سرمایہ استعمال ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ تین انڈسٹریز میں ہوتا تھا، کھاد اور کیمیکلز اور کپڑا۔چوتھا نمبر آتا تھا کھیلوں کے سامان کا اور پھر سرجری کے سامان کا نمبر تھا۔اگران بارہ قسم کی صنعتوں کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ ان میں موجودہ سرمایہ کا بڑا حصہ استعمال ہوتا ہے تو بارہ چیزوں میں مہارت حاصل کرنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے کہ آپ اس کی وجہ سے شریعت کے ایک بڑے مقصد کو معطل کردیں اور شریعت کے اہم احکام پر عملدرآمد کو روکے رکھیں۔

ان بارہ چیزوں میں مہارت کے حصوں کے لیے میں نے دوطریقے تجویز کئے۔ایک شکل تو یہ ہوسکتی ہے کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان بیٹھ کر تمام بینکوں کو بلائے اوران بارہ قسم کی صنعتوں کے لئے جوایکسپرٹیز درکار ہیں اس کو مختلف بینکوں میں تقسیم کردے۔مثلاً نیشنل بینک سے کہا جائے کہ آپ ٹیکسٹائل کے متعلق معاملات میں سرمایہ کاری کریں گے،اور آپ ٹیکسٹائل میں مہارت پیدا کریں۔ٹیکسٹائل کے ماہرین کو اپنے ہاں بلاکر رکھیں۔ٹیکسٹائل میں سرمایہ کاری کا ایک شعبہ بنائیں جس میں ماہرین جمع ہوں۔وہ پاکستان میں ٹیکسٹائل کے معاملات ومسائل کا مسلسل مطالعہ کرتے رہیں۔ٹیکسٹائل کے لوگوں سے برابر رابطہ رکھیں۔جب جب کوئی صنعت کار ٹیکسٹائل انڈسٹری کے لئے قرضہ مانگنے آئے تو وہ اس شعبے سے پوچھیں۔وہ شعبہ مشورہ دے تو قرضہ دیں، ورنہ نہ دیں۔ایک دوسرا بینک مثال کے طور پر کیمیکلز کا ایکسپرٹ ہوجائے۔اس طرح سے انڈسٹریز کو بینکوں میں تقسیم کردیں۔

ایک شکل تو یہ ہوسکتی ہے۔یہ بینک آپس میں بھی کرسکتے ہیں۔اسٹیٹ بینک کے تعاون اور تنسیق سے بھی کرسکتے ہیں۔اوراپنے طور پر بھی کرسکتے ہیں۔ایک دوسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ سارے بینک مل کر از خود، یا اسٹیٹ بینک، یا حکومت پاکستان کے تعاون سے، یا کچھ لوگ پرائیویٹ طور پر ایک مشاورتی سنڈیکیٹ قائم کریں۔

آج کل آپ کو معلوم ہے کہ مشاورت اور کنسلٹنسی کا کاروبار دنیا میں بہت چل رہا ہے۔مختلف میدانوں میں مشاورتی خدمات کے بڑے بڑے ادارے اور دفاتر دنیا بھر میں قائم

ہیں۔ ان مشاورتی خدمات کے ذریعے بہت سے اہم اور مفید کام بھی ہورہے ہیں، اور ہزاروں لاکھوں ماہرین ہر جگہ اور ہر ملک میں اربوں روپے کنسلٹنسی سے کمارہے ہیں۔آج کل مختلف مہارتیں پیدا ہوگئی ہیں۔آج کل کے یہ فنی اور علمی تخصصات اور مہارتیں انتہائی فنی اور دقیق ہوگئی ہیں۔ قانون بھی بہت پیچیدہ اور بڑا دقیق ہوگیا ہے۔انڈسٹریز بڑی دقیق ہوگئی ہیں۔ بینکنگ اور ٹیکس کا معاملہ بڑا دقیق ہوگیا ہے۔ اگر آپ بہت بڑے کاروباری ہیں، کئی ملکوں میں آپ کا کاروبار پھیلا ہوا ہے اور ہر ملک میں آپ کو وہاں کے قوانین کے مطابق ٹیکس دینا ہے۔تو آپ کو لازماً ٹیکسیشن کے ماہرین کے مشورے اور رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے کہ ٹیکسوں کے قوانین بڑے پیچیدہ ہوگئے ہیں۔اس کے لئے کنسلٹنسی کے ادارے قایم ہیں جہاں ٹیکسیشن کے ماہرین کی خدمات دست یاب ہوتی ہیں۔ان اداروں کے پاس آپ جاتے ہیں وہ آپ کو متعلقہ میدان میں مشورہ دیتے ہیں اور آپ سے فیس لیتے ہیں۔ان کے مشورے کی بنیاد پر آپ کھربوں روپے کا کاروبار بھی چلا رہے ہیں اور ٹیکس بھی دے رہے ہیں۔آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ یہ ماہرین جھوٹ بولیں گے یا دھوکہ دیں گے اور آپ کے کاروبار کو ٹھپ کروادیں گے۔

اگر کنسلٹنسی اکاؤنٹیسی میں ہورہی ہے۔کنسلٹنسی قانونی امور میں ہورہی ہے۔ٹیکس کے کام میں ہورہی ہے اور کامیابی سے ہورہی ہے تو کنسلٹنسی اس کام میں بھی ہوسکتی ہے۔ دوچار بڑے کنسلٹنٹ مل جائیں اور ایک سنڈیکیٹ بنالیں جن میں دس بارہ قسم کی مہارتیں جمع کرلیں۔جس بینک کو جس مہارت کے متعلق امور میں مشورے کی ضرورت ہو اس سے کنسلٹنسی کریں کہ ہمارے پاس فلاں صاحب یا فلاں پارٹی اس قسم کی اسکیم لے کر آئی ہے۔ یہ ان کی فیزیبلٹی رپورٹ ہے۔

آج کل بڑے بڑے کاروباروں میں ایک فزیبلٹی کی رپورٹ جو بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ رپورٹ کوئی بڑا کاروبار، تجارت یا صنعت شروع کرنے سے قبل، خاص طور پر حصص کی فروخت اور قرضے کے لئے بنائی جاتی ہے۔اس کے لئے عربی میں دراسۃ الجدوی یا تقریر الجدوی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہ رپورٹ اس مجوزہ منصوبے کی پوری تفصیلات پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے جملہ مالی تخمینہ جات اور آمدنی کے اندازوں پر مشتمل

ہوتی ہے۔اس کی بنیاد اور اس کی تفصیلات اور تخمینوں کو دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ منصوبہ قابل عمل ہے کہ نہیں اور اس میں سرمایہ کاری کرنا مناسب ہے یا نہیں۔

اس طرح کی چیز جب بینکوں کے پاس آئے تو بینک کو چاہئے کہ وہ معاملہ کسی مشاورتی ادارے یا کنسلٹینسی سنڈیکیٹ کو بھیج دے۔ وہاں سے اس پر جو رائے آئے اس کے مطابق بینک قرضہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کر لے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ میری محدود دانست اور غیر متخصصانہ رائے میں یہ دونوں معاملات ایسے ہیں کہ اس میں کوئی حقیقی رکاوٹ نہیں ہے، بہ شرطے کہ نیت صاف ہو۔اور عزیمت کام کرنے کی ہو۔اسی طرح یہ اعتراض مشارکہ کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے۔ بلکہ مشارکہ کے بارے میں زیادہ کیا جاتا ہے۔ مشارکہ پر جو اعتراضات ہیں۔ ان کی وجہ سے ابھی تک پاکستان میں مشارکہ پر کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی۔مضاربہ پر البتہ تھوڑی بہت پیشرفت ماضی میں ہوئی تھی۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب مرحوم کے زمانے ۱۹۸۰ء میں ایک مضاربہ آرڈیننس جاری ہوا تھا۔اس آرڈیننس میں مضاربہ کے ضروری احکام وضع کئے گئے تھے۔اس قانون میں مضاربہ کرنے والوں کو بعض مراعات بھی دی گئی تھیں اور ٹیکس میں چھوٹ بھی دی گئی تھی۔اور کچھ مزید انتظامی رعایتیں بھی دی گئی تھیں۔ چناں چہ بہت سے لوگ مضاربہ کرنے کے لئے آئے۔اور ایک زمانے میں ۱۹۹۰ء۔۱۹۹۳ء کے سالوں میں مضاربوں کا کاروبار خوب پھیلا، اور بہت پھلا پھولا۔مضاربہ کے قانون مجریہ ۱۹۸۰ء میں ایک شریعہ بورڈ کی گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔اس قانون کی متعلقہ دفعات کی رو سے یہ طے کیا گیا تھا کہ ایک ریلیجیس بورڈ ہوگا جو مضاربہ کے ہر کاروبار کو براہ راست دیکھ کر فیصلہ کرے گا کہ وہ جائز ہے کہ نہیں۔ جسٹس خلیل الرحمٰن صاحب اس کے چیئر مین تھے۔ میں اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اس کے ممبر تھے۔کافی عرصے تک میں بھی ممبر رہا۔مفتی تقی عثمانی صاحب بھی بہت طویل عرصے تک اس کے رکن رہے۔مضاربہ کے یہ ادارے کئی سال کام کرتے رہے۔ان کے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ حکومت پاکستان نے ٹیکس میں چھوٹ دے رکھی تھی۔اور بعض اور سہولتیں بھی تھیں۔اس لئے مضاربہ میں بڑی تعداد میں لوگوں نے دل چسپی

لی،اس میں سرمایہ لگایا اور یہ کاروبار چلتا رہا۔

۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء تک یہ کاروبار خوب چلا۔۱۹۹۳ء میں جب بینظیر بھٹو کی حکومت آئی تو اس دوران حکومت نے بعض مراعات واپس لے لیں۔ان مراعات کے واپس لے لینے کی وجہ سے مضاربہ کے کام کو بڑا نقصان پہنچا۔اور مضاربہ کی جو پیش رفت تیزی کے ساتھ ہونا شروع ہوئی تھی وہ کم زور پڑگئی۔کم از کم اس تجربے سے یہ پتہ چلا کہ مضاربہ کا کام پاکستان میں چلایا جاسکتا ہے۔اور اس میں جو رکاوٹیں یا مشکلات بتائی جاتی ہیں وہ حقیقی مشکلات نہیں ہیں۔یا اتنی اہم نہیں ہیں کہ ان کو دور نہ کیا جا سکے۔

مشارکہ کی بنیاد پر ابھی تک پیش رفت زیادہ نہیں ہوئی، بہت تھوڑی سی پیش رفت ہوئی ہے۔مشارکہ سرٹیفکیٹ یا اس طرح کی کچھ چیزیں بعض اداروں نے جاری کیں ہیں۔لیکن یہ ابھی بہت ہی ابتدائی مرحلے میں ہیں۔مشارکہ سے ملتی جلتی بھی ایک چیز ہے۔جو مغرب میں شروع ہوئی ہے۔وہ ایکویٹی فائنانسنگ کہلاتی ہے۔ایکویٹی فائنانسنگ تقریباً مشارکہ ہی کی ایک شکل ہے۔وہ اپنی اسپرٹ اور روح کے لحاظ سے مشارکہ یا شرکہ کی مختلف اقسام سے ملتی جلتی ہے۔

اسی طرح فقہی کتابوں میں،شرکہ کی جو اقسام مذکور ہیں۔مثلاً شرکۃ الابدان ہے،شرکۃ الوجوہ ہے۔یہ پارٹنرشپ کی شکل میں پہلے ہی سے انگریزی قانون میں موجود ہیں۔اور پارٹنرشپ کا انگریزی قانون بنیادی طور پر شریعت سے متعارض نہیں ہے، انگریزی، بلکہ پاکستانی قانون میں، پارٹنرشپ کے احکام وہی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں شرکہ کے ابواب میں مختلف عنوانات کے تحت بیان ہوتے ہیں۔مزید غور کرنے سے کوئی مزید اصلاح ہو سکے وہ بھی کی جاسکتی ہے۔اس لئے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مضاربہ، مشارکہ کو اختیار کرنے میں کوئی حقیقی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔

ایک اور تجربہ جو پاکستان میں کیا جانا چاہئے۔لیکن بینک اس طرف نہیں آرہے وہ ہے جو بعض ملکوں میں کم از کم دو ملکوں میں کام یابی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ان دونوں ممالک کے تجربوں کو اگر اختیار کیا جائے تو اس سے بھی اسلامی بینکاری کے کام کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔یہ مرچنٹ بینکنگ کا تجربہ ہے۔اسلامی بینکاری کے مقاصد کو آگے بڑھانے کی یہ ایک مفید صورت

ہوسکتی ہے۔لیکن ہمارے ملک کے بہت سے ذمے دار حضرات پہلے اس سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔اس کو پہلے اسٹیٹ بینک آف پاکستان بھی نہیں مانتا تھا۔باقی بینک بھی نہیں قبول کرتے تھے۔ اب جزوی طور پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے اس کا دروازہ کھولا ہے۔میں ابھی اس کی طرف آتا ہوں۔

۱۹۸۰ء سے جب سے بینکاری نظام میں اصلاحات کا یہ عمل شروع ہوا ہے اس وقت سے یہ بات کہی جاتی تھی کہ بینک اپنے طور پر بھی کوئی ایک کاروبار ایسا شروع کریں کہ جس میں لوگوں کا سرمایہ براہ راست لگا ہو۔ بینک کے پاس جو رقوم ہیں۔وہ بھی اس سرمایہ کاری میں لگادی جائیں۔اور بینک اس کاروبار کو براہ راست اپنی نگرانی میں شروع کرے، یا پھر اپنے ماتحت ایک کمپنی کے طور پر ایک اپنی ذیلی کمپنی یا سبسڈی کے طور پر کرے۔بینک اس سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔اوراس کام کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات بتاتے تھے۔لیکن جرمنی میں بینکوں نے اس کام کو کام یابی کے ساتھ کیا ہے۔وہاں بینکنگ کا ایک پورا شعبہ ہے جس کو مرچنٹ بینکنگ کہتے ہیں۔یعنی تاجروں کی بینکنگ۔مرچنٹ بینکنگ میں بینک خود کاروبار اور تجارت کرتے ہیں۔اور مرچنڈائز کا کام کرتے ہیں۔اپنی سبسڈیز بھی قائم کرتے ہیں۔ان سبسڈیز میں اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں۔ماہر سے بھی سرمایہ لے کر لگاتے ہیں۔بینک ہر طرح سے اس کے نفع نقصان کا ذمے دار ہوتا ہے۔

اگر یہ بات جرمنی میں کام یاب ہوسکتی ہے تو ہر جگہ ہوسکتی ہے۔جرمنی سے نکل کر کے میرے خیال میں ہندوستان میں خاص کام یابی سے اور وسیع پیمانے پر مرچنٹ بینکنگ ہوئی ہے۔اگر سودی معاملات میں مرچنٹ بینکنگ کا تجربہ کامیاب ہوسکتا ہے تو غیر سودی معاملات میں بہ طریق اولیٰ کامیاب ہوسکتا ہے۔اس لئے کہ تجارت کا کام بہ نسبت سودی طریقے کے غیر سودی طریقے سے بہتر انداز میں چلایا جاسکتا ہے۔یہ بات کہ بینک بہ طور ہولڈنگ کمپنی کے کام کرے اور متعدد ذیلی کاروباری ادارے قائم کرے اور صنعتیں اور کارخانے لگائے اب تیزی سے عام ہورہی ہے۔ہولڈنگ کمپنی اس بڑی کمپنی کو کہتے ہیں جس کے ماتحت تین، چار، ضمنی یا ذیلی کمپنیاں کام کرتی ہیں۔

شروع شروع میں ہمارے بینکار یہ کہتے تھے کہ بینک تو ہولڈنگ کمپنی ہو ہی نہیں سکتا۔

لیکن اب بینکوں میں متعدد ہولڈنگ کمپنیاں بن گئیں ہیں۔ جرمنی میں مرچنٹ بینکنگ کام کام ہورہا ہے۔ جہاں بینک بہ طور ہولڈنگ کمپنی کے کام کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بینک بہ طور ہولڈنگ کمپنی کے کام کررہے ہیں۔اس لئے کم از کم وہ طریقے جو دنیا میں رائج ہورہے ہیں اور ہمارے اسلامی تصورات سے نسبتاً زیادہ قریب ہیں۔ان کو ہمیں پہلے مرحلے میں اختیار کرنا چاہئے۔اور تجربے میں لانا چاہئے۔

ایک اور رکاوٹ جو بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کو صرف حکومت دور کرسکتی ہے۔ وہ حکومت کا ٹیکسوں کا نظام ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ پاکستان میں ٹیکسوں کا نظام بڑا ظالمانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔اب سنا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ کچھ اصلاحات ہوئیں ہیں۔ میں زیادہ نہیں جانتا کہ کتنی اصلاح ہوئی ہے۔لیکن ٹیکسوں کا نظام اب بھی بہت غیر حقیقی ہے، اور بڑا ظالمانہ ہے۔اس ظالمانہ نظام کے ساتھ ساتھ وصولی کے نظام میں بدعنوانیوں نے رہی سہی کسر پوری کردی ہے۔پاکستان کے حالات میں اس کی گنجائش بہت ہے کہ جو سرمایہ ٹیکس کے قابل ہے اس پر ٹیکس نہ دیا جائے یا جو ٹیکس ادا کیا جائے وہ سرکاری خزانے میں نہ جائے، بلکہ درمیان میں دوسرے لوگوں یا سرکاری اہل کاروں کی جیب میں چلا جائے۔

آج سے کوئی بیس سال پہلے آپ کو یاد ہوگا کہ ڈاکٹر محبوب الحق مرحوم پاکستان کے وزیر خزانہ ہوا کرتے تھے۔انہوں نے یہ کہا تھا کہ پاکستان میں جتنا ٹیکس جمع ہونا چاہئے۔اس کا غالباً بیس فیصد سرکاری خزانے میں آتا ہے اور ۸۰ فیصد کے قریب لوگوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔حکومت پاکستان کو جو سالانہ ٹیکس ملتا ہے۔اس وقت وہ تقریباً ٦ کھرب روپے ہے۔اس سال آٹھ کھرب روپے کے قریب وصول یابی کی امید ہے۔اگر آٹھ کھرب روپے کی اس رقم کو سرکاری خزانہ کی متوقع آمدنی کا بیس فیصد مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان مین کم و بیش چالیس کھرب روپے مرکزی حکومت کو بہ طور ٹیکس وصول ہونے چاہئیں۔اگر واقعی اصل آمدنی کا ۸۰ فیصد لوگوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ٹیکسوں کا نظام غیر حقیقی ہے اور قابل عمل نہیں ہے۔ یا تو یہ بتیس کھرب روپیہ جو لوگوں کی جیبوں میں جاتا ہے۔ان لوگوں کو واپس ملنا چاہئے جن کی جیب سے لیا گیا ہے۔ان کے ساتھ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔اور اگر یہ ظلم نہیں ہے تو پھر یہ سارا روپیہ سرکاری خزانے میں جانا چاہئے۔تاکہ عامۃ الناس

کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو۔

یہ دراصل کرپشن اور لوٹ مار ہے جس کی وجہ سے بیشتر لوگ ٹیکس دینے میں تامل کرتے ہیں۔اس نظام سے لوگ گھبراتے ہیں، اور ڈرتے ہیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نظام میں ٹیکس وصول کرنے والے کو بہت غیر معمولی اور وسیع اختیارات شروع سے حاصل تھے، اب بھی حاصل ہیں۔ایک مرتبہ کوئی شریف انسان بدقسمتی سے ٹیکس کلکٹر کے ہتھے چڑھ جائے تو پھر زندگی بھر اس کے پنجے سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔اور جب تک وہ ٹیکس کلیئر کرنے والے کی جیب گرم نہ کرے اس کی جان نہیں چھوٹتی۔اس کی وجہ سے تجارت کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ اپنے تجارت کے کاروبار کے تین حسابات رکھیں۔ایک حساب وہ جو حکومت کی طرف سے ٹیکس وصول کرنے والے کو دکھانے کے لئے ہو۔جب وہ ٹیکس لینے آئے تو اس کو وہ حساب دکھایا جائے۔جس کے حساب سے واجب الادا ٹیکس بہت تھوڑا بنے۔ پاکستان کے بعض سیاسی راہ نما جو کئی کئی سالوں سے بیرون ملک مقیم ہیں اور وہاں کے قیام اور عیاشیوں پر اربوں روپے خرچ کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات کا ٹیکس محض دوسو روپے، ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتا۔میں یونیورسٹی کے ایک استاد کی حیثیت سے چار پانچ ہزار روپے ماہ وار ٹیکس ادا کرتا ہوں۔میں اپنے خرچ پر انگلستان میں ایک دن بھی کسی بڑے ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتا، لیکن ایسے بڑے لیڈرز جو یہاں دوسو روپے، اڑھائی سو روپے ٹیکس ادا کیا کرتے تھے۔وہ سال ہا سال سے انگلستان کے اعلیٰ ترین محلات میں مقیم ہیں۔ پوری دنیا کا سفر کرتے ہیں۔اور کوئی ٹیکس کا نظام ان سے نہیں پوچھتا کہ آپ کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی۔اس سے اندازہ کرلیں کہ ہمارے ہاں ٹیکسوں کا نظام کتنا غیر حقیقی ہے۔

تاجر حضرات دوسرا اور حقیقی حساب کتاب اپنے لئے رکھتے ہیں۔اور تیسرا وہ اپنے شرکا کو دکھانے کے لئے رکھتے ہیں۔اگر تاجر بہت زیادہ دیانت دار ہوں تو وہ دو حساب رکھیں گے، ایک اپنے لئے اور ایک حکومت کے لئے۔اب چوں کہ ان کو ایک سے زائد حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے۔اور اس کو وہ چھپاتے بھی نہیں، بلکہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ہم دو دو تین تین کتابیں رکھتے ہیں۔اگر حکومتوں کا نظام، ٹیکس کا نظام عادلانہ ہو۔قابل عمل ہو، ظالمانہ اور سخت نہ ہو، تو مشارکہ، مضاربہ کے کام میں بڑی آسانی اور بہت سہولت پیدا ہو جائے گی۔

اسی طرح حکومت پاکستان کے پاس کئی ادارے ہیں۔ جن کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ٹرانسپرینسی یعنی شفافیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دیکھیں کہ پاکستان میں کارپوریٹ فائنانسنگ یعنی اجتماعی کاروبار یا اداراتی کاروبار جو ہو رہا ہے وہ قواعد وضوابط کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا۔ اگر یہ ادارے فعال ہوں اور موثر انداز میں کام کریں۔ جیسا کہ دنیا بھر میں ہر جگہ کرتے ہیں تو اسلامی خطوط پر سرمایہ کاری بہت آسان ہو جائے گی۔ دنیا بھر میں اسی طرح کاروبار ہو رہا ہے۔ دنیا میں کوئی اتنے بڑے پیمانہ پر ٹیکس چوری نہیں کرتا۔ دنیا میں کوئی لوگوں کا سرمایہ لے کر نہیں بھاگ جاتا۔ ہمارے ہاں جو اٹھتا ہے وہ سرمایہ لے کر بھاگ جاتا ہے۔

آپ نے ۱۹۸۰ میں غیر سودی تجارتی کمپنیوں کا حال سنا ہوگا۔ فائنانس کمپنیاں بنیں۔ تاج کمپنی بنی، ان کمپنیوں میں کیا کیا نہیں ہوا؟ لوگوں سے قرآن کے نام سے سرمایہ لیا اور لے کر فرار ہو گئے۔ اور آج تک وہ لوگ رو رہے ہیں۔ دھوکے اور فریب کا یہ کام دنیا میں کیوں نہیں ہوتا۔ امریکہ میں کیوں کوئی کسی کا پیسہ لے کر نہیں بھاگا۔ دبئی میں کوئی کیوں کسی کا پیسہ لے کر نہیں بھاگتا۔ دبئی تو چھوٹی سی جگہ ہے، وہاں سے بھاگنا اتنا آسان ہے کہ روزانہ ہزاروں فلائیٹیں آتی جاتی ہیں۔ لاکھوں لوگ آتے جاتے ہیں۔ اور دنیا بھر کا سرمایہ دبئی میں لگا ہوتا ہے۔ دنیا بھر کا سرمایہ ہانگ کانگ اور سنگاپور میں لگا ہوتا ہے۔ لیکن وہاں کا نظام اتنا پختہ ہے کہ کسی آدمی کے لئے دھوکہ دینا ممکن نہیں ہے۔

اگر یہ چھوٹے چھوٹے ممالک، یہ بدو جو کل تک، چالیس پچاس سال پہلے تک ریگستان میں اونٹ چراتے تھے۔ میں خدانخواستہ اپنے عرب بھائیوں کی توہین نہیں کر رہا ہوں، بلکہ محض ایک امر واقع کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ وہ لوگ جن کا پس منظر جدید تجارت اور معیشت میں زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا مؤثر اور فول پروف نظام بنا سکتے ہیں۔ تو ہم کیوں نہیں بنا سکتے۔ اب اس چوری پر مزید سینہ زوری یہ ہے کہ اپنی نااہلی اور کام چوری کو، حکومت کی کرپشن اور کمزوری کو، ملکی اداروں کی کمزوری اور نااہلی کو شریعت کے کھاتے میں ڈالتے ہیں کہ شریعت کے احکام پر عمل نہیں ہو سکتا۔

یہ بات نہ صرف شریعت کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے بلکہ انسانیت اور اخلاق کے خلاف بھی بغاوت ہے۔ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی تو ہے ہی ہے، لیکن ان سارے

جرائم کا جو ملبہ ہے وہ آپ اپنے پر ڈالنے کی بجائے، اپنی کمزوریوں کو قبول کرنے اور اپنی کوتاہیوں کوتسلیم کرنے کی بجائے، ان سب خامیوں کی اصلاح کرنے کے بجائے آپ یہ کہیں کہ شریعت کے احکام اس لئے نا قابل عمل ہیں کہ میں چور ہوں، شریعت کے احکام اس لئے نا قابل عمل ہیں کہ میرے بھائی بند چور ہیں، شریعت کے احکام اس لئے نا قابل عمل ہیں کہ میری حکومت چور ہے۔ یہ عذر کس حد تک قابل قبول ہے، بالخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان میں، وہ مخفی نہیں۔

اس عذر لنگ کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اگر بالفرض سب لوگ چور ہیں تو ان کو اچھا انسان بناؤ۔ توبہ کرواؤ، ان کی چوری کا راستہ بند کرو۔ بہ ہر حال یہ ایک ایسا عذر لنگ ہے جسے سنتے سنتے پچیس سال ہو گئے، لیکن اس کا کوئی جواب دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔

ایک اور چیز ہے جو فقہائے مالکیہ کی رائے کے مطابق بعض جدید فقہا نے اختیار کی ہے۔ ممکن ہے وہ قابل عمل ہو، ممکن ہے اس سے مسئلے کا حل نکل آئے۔ ایک عام شکایت یہ ہے کہ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی مجوزہ کمپنی نفع بخش ثابت ہوگی، وہ رقم جمع کرتے ہی، مطلوبہ مقدار میں حصص کی فروخت مکمل ہوتے ہی، اپنے دعوؤں اور وعدوں سے پھر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج کسی نے کمپنی لانچ کی اور اس نے کہا کہ میرا منظور شدہ سرمایہ پچیس کروڑ روپے ہے۔ اور ادا شدہ سرمایہ پانچ کروڑ روپے ہے۔ لہٰذا ۲۰ کروڑ روپے کے شیئرز میں لانچ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے بیس کروڑ روپے کے شیئرز جاری کئے اور بیس کروڑ روپے کا سرمایہ لوگوں سے لے لیا۔

جب وہ لوگوں سے سرمایہ جمع کرتا ہے۔ تو وہ اپنی ایک فزیبلٹی رپورٹ جاری کرتا ہے، اس میں یہ واضح کرتا ہے کہ یہ انڈسٹری جو میں لگانا چاہتا ہوں اس کی کام یابی کے کتنے امکانات ہیں؟ اس کی کام یابی کے لئے میں کیا کیا طریقے اختیار کروں گا؟ اس کے کتنے حصے دار ہوں گے؟ یہ رپورٹ ایک بڑی ضخیم دستاویز ہوتی ہے یہ دستاویز جاری کی جاتی ہے۔ قانون کی رو سے اس کو جاری کرنا یا پبلک کرنا قانون کا تقاضا ہے۔ اس کے آرٹیکلز اور میمورنڈم جاری ہوتے ہیں۔ ان کو اخبار میں شائع کرنا لازمی ہے، یہ بھی قانون کا لازمی تقاضا ہے اور سب شائع کرتے ہیں۔

لیکن ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ یہ فزیبلٹی کے نام سے اونچے

اونچے وعدے کیے جاتے ہیں۔ اور لوگوں کو غلط اور بے بنیاد نقشے دکھائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فزیبلٹی رپورٹ ہے، اس کے مطابق میں سیمنٹ کی انڈسٹری کراچی سے چالیس میل دور کے فاصلے پر فلاں پہاڑ کے اندر لگاؤں گا، وہاں اس طرح کی مٹی یا اس طرح کے منرلز پائے جاتے ہیں کہ اس سے بہت عمدہ سیمنٹ بن سکتا ہے، اس سیمنٹ کی کراچی میں اتنی کھپت ہوگی۔ لانے لے جانے میں اتنا خرچہ ہوگا اور یہ سیمنٹ خوب چلے گا اور میں چالیس روپے کے شیئرز پر چالیس روپے منافع سالانہ دینے کے قابل ہوں گا۔ یہ سارا بکھیڑا شروع شروع میں تو خوب زور شور سے چلتا ہے۔ شیئرز تیزی سے بکتے ہیں۔ جب مطلوبہ رقم وصول ہو جاتی ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب وہ فیکٹری تو چلی ہی نہیں۔ میں نے کھود کے دیکھا، پہاڑ کے اندر سے تو کچی مٹی نکلی۔ اب جن کا سرمایہ تھا وہ ڈوب گیا۔ جو شیئرز چالیس روپے میں خریدا تھا۔ وہ بازار میں چار روپے کا بھی نہیں بکتا۔ یہ ہمارے ملک میں روز ہوتا ہے۔

اس راستے کو روکنے کے لئے بعض جدید فقہا نے مالکی نقطہ نظر کے مطابق ایک رائے اختیار کی ہے۔ بعض مالکی فقہا نے یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی مضارب کسی رب المال کو یقین دلائے کہ میں مضاربت کے لئے کاروبار کرنے فلاں جگہ جا رہا ہوں، وہاں کاروبار میں بہت نفع ہوتا ہے۔ اور اس کے یقین دلانے کی وجہ سے رب المال اس کو پیسے دے دے۔ حال آں کہ قبل ازیں وہ پیسے دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کے یقین دلانے کی وجہ سے اس نے پیسے دے دیئے۔ مضارب نے بعد میں آکر یہ دعویٰ کیا کہ اس مضاربے میں نقصان ہو گیا تو مضارب کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ حاکم عدالت یا قاضی اس کو مجبور کرے گا کہ جتنا نفع اس نے کہا تھا یا تو وہ ادا کرے یا یہ ثابت کرے کسی ایسی وجہ سے نفع کم ہوا ہے، یا نقصان ہوا ہے جس میں اس کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یعنی آفت ساوی کی وجہ سے نقصان ہو گیا یا راستے میں مال لے کر آ رہا تھا، لیکن ڈاکہ پڑ گیا۔ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ اس طرح کی کوئی آفت اگر آئی ہے تو عدالت اس عذر کو قبول کرے گی۔

لیکن اگر ایسی آفت ساوی یا جس کو آج کل انگریزی میں **Force majeur** کہتے ہیں پیش نہیں آئی تو پھر اس کو عدالت مجبور کرے گی کہ وہ اعلان شدہ شرح کے مطابق نفع ادا کرے اور اصل رقم بھی ادا کرے۔ آج کل عام طور پر عرب دنیا میں فقہا کا رجحان یہی ہے کہ اس اصول کی

بنیاد پر عمل ہونا چاہئے۔ فزیبلٹی رپورٹ میں جو چیز کہی گئی تھی اس کے بارے میں یہ تسلیم کیا جائے کہ کاروبار اسی طرح سے ہوا ہے اور اسی طرح سے چلا ہے، اس کے خلاف کسی دعوے کو نہ سنا جائے۔ اِلّا یہ کہ وہ ثابت کرے کہ کسی ایسی وجہ سے جو اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ جس کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ ان اسباب کے استثنا کے علاوہ کوئی اور عذر نہیں سنا یا جائے گا۔ اگر قانون میں اس بات کا اہتمام کردیا جائے تو امید ہے کہ یہ نظام کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

اسلامی ڈویلپمنٹ بینک، جو اسلامی دنیا کا گویا ورلڈ بینک تھا، جو نمونے کے طور پر بنایا گیا تھا وہ اسی اصول کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ اور وہاں جو بھی قرضے دیئے جاتے ہیں اس کے بارے میں یہ اصرار کیا جاتا ہے کہ ان کی واپسی اور ادائیگی فزیبلٹی رپورٹ کے اعلان کے مطابق کی جائے۔

تین اور چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل ہیں جو ایک زمانے میں بڑے اہم مسائل تھے۔ اب تقریباً طے شدہ ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں زیادہ تفصیل سے کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک بڑا مسئلہ بلکہ دو بڑے مسئلے وہ ہیں جو آپس میں زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا تھا کہ کیا فقہ اسلامی شخصیت اعتباری کو تسلیم کرتی ہے۔ کیا Juristic Person کا تصور فقہ اسلامی میں قابل قبول ہے۔ Juristic Person یا شخصیت اعتباریہ، یا شخصیت قانونیہ کے جواز یا عدم جواز کا سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ آج کل جو کمپنیاں کام کرتی ہیں، یا کارپوریٹ فنانسنگ کا جو کام ہو رہا ہے یہ ساری کمپنیاں شخصیت اعتباریہ مانی جاتی ہیں۔ اور کمپنی کی شخصیت اعتباری اپنے مالکان کی شخصیت سے مختلف ہوتی ہے۔ چوں کہ مالکان اور حصص داران کی شخصیت کمپنی کی شخصیت سے مختلف ہوتی ہے لہٰذا ان کا ضمان بھی بہت محدود ہوتا ہے یعنی Limited Liability یا ذمے داری محدود ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر محدود ذمے داری کا تصور اور شخصیت اعتباریہ یہ دونوں تصور ملے جلے بلکہ قریب قریب لازم وملزوم ہی ہیں۔

اگرچہ اس دور میں تقریباً فقہا کی غالب ترین اکثریت کا رجحان یہ ہے۔ مصطفیٰ زرقاء سے لے کر ہمارے پاکستان کے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب تک، کہ فقہ اسلامی شخصیت

اعتباریہ کو بھی تسلیم کرتی ہے اور محدود ذمے داری کے اصول کو بھی قبول کرتی ہے۔اس کے باوجود مجھے اس کو سو فیصد قبول کرنے میں تامل ہے۔اپنی اس بات کو، یا اپنے اس تامل کو میں ایک جملے میں ادا کرتا ہوں کہ اسلام میں محدود ذمے داری کا لامحدود تصور یا لامحدود انطباق نہیں ہے۔محدود ذمے داری کا تصور تو ہے لیکن اس کا لامحدود اطلاق احکام شریعت کی رو سے قابل قبول نہیں۔دور جدید کے نامور علماء میں سے شام کے ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کو محدود ذمے داری اور شخصیت اعتباریہ کے تصورات سے اتفاق نہیں ہے اور وہ شدومد سے ان دونوں تصورات کی تردید کرتے ہیں۔

بعض جگہ قدیم فقہا نے بھی ایک طرح سے محدود ذمے داری کو تسلیم کیا ہے۔مثلاً مضارب کا ذمہ محدود ہے۔مضارب اگر مال مضاربہ لے کر تجارت کے لئے جاتا ہے، راستے میں مال کا نقصان ہوجاتا ہے جس میں اس کی کسی کوتاہی کو دخل نہیں، مثلاً مال میں اس نے کوئی زیادتی نہیں کی، یا مال کو ایسی جگہ خرچ نہیں کیا جہاں خرچ نہیں کرنا چاہئے تھا، تو رب المال اس مال کی حد تک وہ ذمے دار ہوگا، اس سے زیادہ کا نہیں ہے۔یا رب المال جو مشارکہ میں مال لگاتا ہے وہ اس مال کی حد تک ذمے دار ہے۔اپنے ذاتی اموال جو اس کے پاس ان اموال شرکت کے علاوہ ہیں جو اس نے اس مشارکہ یا مضاربہ میں نہیں لگائے تھے ان کی حد تک وہ ذمے دار نہیں ہوگا۔

گویا یہ بات ایک حد تک فقہا نے بھی تسلیم کی ہے۔لیکن آج کل مغربی قانون میں جو تصور ہے کہ محدود ذمے داری کے اصول کو ہر جگہ برتتے ہیں اور یوں محدود ذمے داری اس اصول کا اطلاق لامحدود ہوجاتا ہے اور اس کو لوگوں کے خلاف ظلم کے لئے اور لوگوں کے سرمائے کو اکل اموال الناس بالباطل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یہ شرعاً قابل قبول کیسے ہوسکتا ہے؟

اس تصور کا غلط استعمال اسی لئے ہورہا ہے کہ اس کو بلا روک ٹوک اختیار کرلیا جاتا ہے۔اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ مثلاً چار آدمی جو بڑے تیز اور ہوشیار ہوں انہوں نے ایک کمپنی قائم کی۔اس کا ادا شدہ سرمایہ مثلاً ایک کروڑ روپے ہے، ۲۵، ۲۵ لاکھ چاروں نے مل کر ادا کردیئے، اور Authorize Capital جو لوگوں سے وصول کرنے اور حصص فروخت کرکے

جمع کرنے کی اجازت ہے وہ مثلاً دس کروڑ روپے ہے۔اب یہ دس کروڑ روپے انہوں نے عام لوگوں سے جمع کر کے کاروبار شروع کیا۔کاروبار شروع کر کے سب سے پہلے انہوں نے اپنا سرمایہ نکال کر الگ کرلیا، گویا سب سے پہلے اپنا ایک کروڑ محفوظ کرلیا، اس کے بعد انہوں نے کچھ چکر چلا کر دعویٰ کرنا شروع کردیا کہ کاروبار تو فیل ہوگیا اور کاروبار فیل ہونے کے بعد ہماری ذمے داری چوں کہ محدود تھی اس لئے وہ ختم ہوگئی لہٰذا ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہمارا بھی نقصان ہوا، آپ کا بھی نقصان ہوا۔اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ جس جس نے پیسہ لگایا تھا وہ رو دھو کے خاموش ہوجاتا ہے کہ اب کیا ہوسکتا ہے۔دوسری طرف ان ہی لوگوں نے اب کسی دوسرے نام سے دوسرا کاروبار شروع کردیا۔اس میں یہی کھیل کھیلا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، پھر پانچواں کاروبار شروع ہوتا اور ''ناکام'' ہوتا رہتا ہے۔یہ سلسلہ ہمارے ملک میں زور وشور کے ساتھ جاری ہے۔بعض دوسرے ملکوں میں بھی ایسا ہوتا تھا۔انہوں نے سخت قوانین کے ذریعے اس پر پابندی لگادی ہے۔لیکن محض قوانین سے ہمارے ملک میں اس طرح کی فریب کاری کو روکا نہیں جاسکتا۔

آپ زید پر پابندی لگائیں گے تو وہ اپنے بیٹے بکر کے نام سے کاروبار شروع کردے گا۔ آپ کس قانون سے زید کے بیٹے بکر کو روکیں گے کہ چوں کہ زید نے دھوکہ دیا تھا لہٰذا بکر بھی دھوکہ دہی کرے گا۔کوئی عدالت اس کو تسلیم نہیں کرے گی، بالفرض اگر عدالت نے اس کو مان بھی لیا اور بیٹے بکر پر پابندی لگا بھی دی تو وہ بھائی عمرو کے نام سے وہی کام دوبارہ شروع کردے گا۔اپنے کسی ملازم کے نام سے، کسی ماتحت کے نام سے، گھر کا کام کرنے والی مائی جسے کچھ پتہ نہ ہو اس سے دستخط کرواکے اور کاروبار شروع کردے گا اور پھر اسی طرح سے کرے گا۔

اس لئے میری ناچیز رائے میں Limited Liability کا جو تصور اسلام میں ہے اور جس کی شریعت نے اجازت بھی دی ہے۔اس کا اطلاق ایک خاص حد تک ہی کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس کو کہاں کہاں برتا جائے گا۔کہاں کہاں استعمال کیا جائے گا۔اس کے لئے مفصل قوانین ہونے چاہئیں اور بعض احکام مرتب کئے جانے چاہئیں۔بعض احکام کا تصور میرے ذہن میں آتا ہے کہ وہ وضع کئے جاسکتے ہیں۔بعض شرائط وضع کی جاسکتی ہیں۔جس سے اس

Limited Liability کے تصور کے ناجائز استعمال سے روکا جا سکے۔لیکن بہر حال یہ ایک اہم مسئلہ ہے جومزید غور وخوض کا محتاج ہے اور اگر اس کو حل نہ کیا گیا تو خاصا پیچیدہ ہوسکتا ہے۔

دوسرا بڑا مسئلہ ایک اور ہے جو بینکوں کو بھی پیش آتا ہے اور ہر کاروبار کرنے والے کو پیش آتا ہے۔وہ فیوچر سیل کا مسئلہ ہے۔فیوچر سیل کی ایک شکل تو بہت سادہ اور آسان ہے جو بیع سلم کے دائرے میں لائی جا سکتی ہے۔بیع سلم بھی ایک طرح کی فیوچر سیل ہے کہ آج آپ نے بائع یا سپلائر کو پیسے ادا کر دیئے۔اور مال کی حوالگی وہ آپ کو ایک سال کے بعد کرے گا،یا چھ مہینے بعد کرے گا،یا جو بھی وقت طے ہوا ہو اس پر مال فراہم کرے گا۔یہ بھی ایک طرح کی فیوچر سیل ہی ہے۔لیکن آج کل فیوچر سیل کی ایسی شکلیں استعمال ہونے لگی ہیں جو شرعاً ناجائز معلوم ہوتی ہیں۔یہ وہ شکلیں ہیں جو بیع مالیس عندک کے ذیل میں آتی ہیں۔لا تبع مالیس عندک،شریعت کا حکم ہے جس کی رو سے بیع معدوم اور بیع غیر معلوم ناجائز ہے۔

یوں تو ایک طرح سے بیع سلم بھی لا تبع مالیس عندک کے ذیل میں آتی ہے۔لیکن اس کی عام ضرورت کی وجہ سے شریعت نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔یہ ایک استثنائی صورت ہے جو لا تبع مالیس عندک کے اس اصول سے اس لئے مستثنیٰ ہے کہ بیع سلم میں وہ قباحتیں نہیں ہیں جو بیع معدوم کی دوسری صورتوں میں پائی جاتی ہیں۔اب کون سی چیزیں فیوچر سیل میں ایسی ہیں جو اس استثنا کے تحت آ سکتی ہیں؟ کون سی ایسی ہیں جو نہیں آسکتیں؟

یہ ایک خاصا پیچیدہ اور مشکل معاملہ ہے اور آج سے کئی سال سے،بلکہ دس بارہ سال سے پاکستان میں زیر غور ہے۔پاکستان میں کاروبار کرنے والے بعض محتاط لوگ وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں پوچھتے بھی رہتے ہیں اور رائے لیتے رہتے ہیں۔اور مختلف اہل افتا اس کے بارے میں رائے دیتے رہے ہیں۔نہ فیوچر سیل کی ساری شکلیں ناجائز ہیں۔نہ ساری شکلیں جائز ہیں۔کون سی شکلیں جائز ہیں؟اس کا ایک ابتدائی اور سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ فیوچر سیل کی وہ شکلیں جائز ہیں جو بیع سلم قرار دی جا سکتی ہوں یا بیع سلم کی حدود میں آتی ہوں۔اس کے علاوہ بھی ہوسکتا ہے کچھ شکلیں جائز ہوں۔جو شکلیں ناجائز ہیں وہ کون سی ہیں ان کے اسباب کیا ہیں؟ان اسباب کا تعین ہونا چاہئے۔اس کی شرائط یا اس کے احکام کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ لکھنا چاہئے۔یہ ایک اور مسئلہ ہے جو شریعت کی روشنی میں جدید اسلامی بینکاری کے حوالے سے زیر غور ہے۔

پاکستان میں اسلامی بینکاری

پاکستان میں اسلامی بینکاری کا کام اتنا ہی پرانا ہے۔ جتنا پاکستان خود پرانا ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ مسئلہ پاکستان سے زیادہ قدیم ہے تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔

۱۹۳۷ء میں علامہ اقبالؒ نے قائد اعظم کو ایک اہم خط لکھا تھا۔ دراصل ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے سالوں میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے درمیان انتہائی اہم خط وکتابت ہوئی تھی۔ اس خط وکتابت میں علامہ اقبال نے مجوزہ مملکت پاکستان کے بارے میں بہت سے اموراور مسلمانوں کے بارے میں بہت سے مسائل کی طرف قائداعظم کوتوجہ دلائی۔ اس ضمن میں ایک خط میں قائداعظم نے علامہ اقبال سے غالباً مستقبل کی مسلم مملکت کے معاشی پہلوؤں کے بارے میں استفسار کیا۔ قائداعظم کا اصل خط تو محفوظ نہیں ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے ہاں قائداعظم کا خط ضائع ہوگیا۔ لیکن قائداعظم کے پاس علامہ اقبال کا خط محفوظ رہا۔ علامہ اقبال کے جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظم نے یہ پوچھا ہوگا کہ پاکستان بننے کے بعد سب سے بڑا اہم مسئلہ یہ پیش آئے گا کہ مسلمانوں کی غربت اور فقر کو کیسے دور کیا جائے۔ مسلمان جن جن علاقوں میں اکثریت میں ہیں وہاں وہ عموماً بہت غریب اور فقیر ہیں۔ دولت اکثر ہندوؤں کے پاس ہے۔ انڈسٹری ہندوؤں کے پاس ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ساری انڈسٹری ہندوستان میں رہ جائے گی۔ پاکستان میں اکثر ریگستانی اور غریب علاقے آئیں گے۔ غالباً اس طرح کا کوئی سوال تھا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے روٹی کے مسئلے کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ شریعت میں اس مسئلے کا مکمل حل موجود ہے۔ اگر نئی مجوزہ مملکت میں شریعت کے احکام کو مناسب انداز میں نافذ کیا جائے۔ تو مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے روٹی اور فقر کا مسئلہ آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پاکستان کے صف اول کے مؤسسین، پاکستان بننے سے دس سال پہلے سے اس پر غور کر رہے تھے کہ شریعت کی روشنی میں پاکستان کے معاشی امور اور اقتصادی مسائل کو کیسے حل کیا جائے۔

اس کے بعد جب پاکستان وجود میں آ گیا تو پہلا کام یہ ہوا کہ پاکستان کا اپنا اسٹیٹ بینک قائم ہوا۔ اسٹیٹ بینک یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو قائم ہوا تھا۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو قائداعظم شدید بیمار تھے۔ اور وہ زیارت میں علاج کے لئے مقیم تھے۔ وہ شدید کمزوری اور بیماری کی حالت میں زیارت سے صرف اس کام کے لئے کراچی آئے تھے کہ خود اپنے ہاتھوں سے پاکستان کے مرکزی بینک کا افتتاح کریں۔ اور آپ کے اسی شہر میں انہوں نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا تھا۔ اس افتتاحی تقریب میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ موجود دور نے دو معاشی نظام دنیا کو دیئے ہیں اور ان دونوں معاشی نظاموں نے مصائب اور بیماریوں یعنی miseries and maladies کے علاوہ دنیا کو کچھ نہیں دیا۔ آفات اور امراض کے علاوہ دنیا کو کچھ نہیں دیا۔ اور آج انسانیت جن پریشانیوں، امراض اور بیماریوں کا شکار ہے وہ دورِ جدید کے دو معاشی نظاموں کی وجہ سے ہیں۔ ہماری ذمے داری یہ ہے کہ ہم اسلامی شریعت کے احکام کی روشنی میں ایک ایسا نظام وضع کریں، جو عادلانہ ہو اور دنیا کو ان دونوں نظاموں کے ظالمانہ نتائج سے محفوظ رکھ سکے۔

قائداعظم نے مزید کہا تھا کہ میری ہدایت یہ ہے کہ آپ تحقیق کا ایک شعبہ قائم کریں۔ جو آپ کو یہ بتائے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اسلام کی تعلیم کی بنیاد پر ایک نیا معاشی نظام کیسے وضع کیا جا سکتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا تھا کہ میں آپ کی اس تحقیق کے نتائج کا شدت سے منتظر رہوں گا، اور جن جن نتائج تک آپ پہنچتے جائیں مجھے بھی ان سے مطلع کرتے جائیں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قائداعظم کی آخری تقریر تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی تقریر نہیں کی اور اس کے بعد انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جب کراچی آئے تو وہ اسٹریچر پر لائے گئے تھے اور گھر پہنچنے پر یا شاید اس سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ لہٰذا یہ ان کی ایک وصیت ہے اور ایک اعتبار سے بستر مرگ سے کہی جانے والی آخری بات ہے جو انہوں نے کہی۔ اس قوم سے انہوں

نے آخری بات یہ کہی کہ اسلامی تعلیمات و احکام کی بنیاد پر ایک ایسا معاشی نظام وضع کرے جو دونوں رائج الوقت معاشی نظاموں کے مصائب و مشکلات اور امراض سے انسانیت کو نجات دلا سکے۔ یہ ذمے داری انہوں نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سپرد کی تھی۔

ایک مرتبہ میں نے اسٹیٹ بینک کے ذمے داروں سے پوچھا کہ ۱۹۴۸ء سے آج تک آپ نے اس ذمے داری کو کیسے نبھایا ہے اور کیا چیز تیار کی ہے۔ ایک مرتبہ ایک سابق گورنر اسٹیٹ بینک سے ان موضوعات پر بات ہورہی تھی۔ دوران گفتگو انہوں نے فرمایا کہ علماء کوئی تجویز لے کر نہیں آتے۔ میں نے کہا حضرت! علماء نے تو بہ قول آپ کے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ آپ پاکستان بنائیں جہاں اسلامی نظام ہوگا۔ یہ تو آپ نے کہا تھا۔ قائد اعظم نے بار بار کہا تھا کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنایا جائے گا۔ اور آپ کے اسٹیٹ بینک کو ہدایت کی تھی۔ آپ کے ہاں ایک شعبہ بھی موجود ہے۔ یہ تو ذمے داری آپ کی ہے۔ آپ بتائیے کہ آپ نے کیا سوچا ہے۔ علمائے کرام سے آپ یہ تو پوچھ سکتے ہیں کہ ہم نے یہ نظام اور یہ خاکہ سوچا ہے۔ آپ بتائیے کہ یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔ لیکن جو ذمے داری آپ کو دی گئی تھی وہ آپ علمائے کرام پر کیوں ڈالتے ہیں؟ خیر یہ تو ایک الزامی جواب تھا۔

میں اس بات سے نتیجہ نکالتا ہوں کہ بانیان پاکستان کے ذہن میں یہ تصور روز اول سے موجود تھا کہ یہاں اسلامی شریعت کے مطابق معیشت کی تنظیم نو کرنی ہے۔ بعض غیر ذمے دار اور ظالم لوگ کہتے ہیں کہ جناح صاحب قوم کو اسلام کے نام پر دھوکہ دے رہے تھے، سیاست کر رہے تھے۔ ان کا اصل پروگرام ایک سیکولر ریاست قائم کرنے کا تھا۔

تاریخی شواہد اس الزام کی واضح طور پر تردید کرتے ہیں۔ قائد اعظم علامہ اقبال کو خط لکھ رہے ہیں، وہ اقبال کو کیا دھوکہ دے رہے تھے؟ بستر مرگ پر ایک بیمار بوڑھے کو کیا دھوکہ دے رہے تھے۔ اقبال بستر مرگ سے ان کو لکھ رہے تھے۔ پرائیویٹ خط و کتابت جو بعد میں چھپی اس میں کسی کو دھوکہ دینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسری طرف ایک بیمار آدمی جو بستر مرگ سے اٹھ کر زیارت سے کراچی آیا ہے۔ جو صرف اسی کام کے لیے چل کر کوئٹہ سے کراچی پہنچا ہے اور اسٹیٹ بینک کو ہدایت دے رہا ہے۔ اس میں وہ کیا سیاست کرے گا۔

اس کے بعد جب پاکستان کا پہلا دستور بنا، بلکہ جو پہلا دستوری مسودہ پیش ہوا۔ خواجہ

ناظم الدین مرحوم پاکستان کے وزیراعظم نے ۱۹۵۲ء میں اسی کراچی شہر میں دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیا اس میں باب نمبر دو میں ریاست کے مقاصد واہداف لکھے ہوئے تھے کہ اس نئی ریاست کے مقاصد واہداف کیا ہیں؟ اس میں لکھا ہوا تھا کہ Elimiation of Riba in all its forms کہ ربا کو اپنی تمام شکلوں میں مکمل طور پر ختم کرنا ریاست کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کے مرتبکئے ہوئے آئینی مسودے میں لکھا ہوا تھا۔ یہی بات ۱۹۵۴ء کے آئینی مسودے میں لکھی ہوئی تھی۔ یہی بات ۱۹۵۶ء کے آئین میں لکھی ہوئی تھی۔ یہی بات ۱۹۶۲ء میں جنرل محمد ایوب خان تک نے اپنے دستور میں لکھی تھی۔ یہی بات ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی لکھی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ربا کے خاتمے کا اصول ایک متفقہ اور طے شدہ اصول رہا ہے، اس پر پاکستان کا ایک نیشنل کمٹمنٹ ہے جو دستور پاکستان میں لکھا ہوا ہے۔ پھر ۱۹۷۳ کا دستور پاکستان تو وہ دستاویز ہے جو پوری قوم کے اتفاق رائے اور ہر طبقہ کے کمٹمنٹ کی آئینہ دار ہے۔ اس میں یہ کمٹمنٹ ۱۹۵۲ء سے آج تک چلا آرہا ہے۔

شروع شروع میں یہ سوال پیدا ہوا، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں بعض لوگوں نے جان بوجھ کر باربار یہ سوال اٹھایا کہ دستور میں جس میں ربا کی حرمت کا ذکر ہے! اس سے کیا مراد ہے؟ کیا بینکنگ انٹرسٹ بھی ربا ہے۔ اس پر بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ بینکنگ انٹرسٹ ربا نہیں ہے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا بڑا چرچا تھا۔ وہ حکومت پاکستان کے قریبی مشیروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ بینک انٹرسٹ ربا نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں بھی یہی لکھا تھا۔ جس کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ اور متجددین کے حلقے میں اس مضمون کی بہت پذیرائی کی گئی۔ اس مضمون کا جواب بھی سپریم کورٹ کے فیصلے میں موجود ہے۔ اس حصے کی ترتیب میں جس میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ان دلائل کا جائزہ لیا گیا میں نے بھی حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے یہ دلائل کوئی نئے نہیں ہیں۔ یہ وہی ادھر کی ادھر کی باتیں ہیں جو رشید رضا نے اس سے پہلے لکھی تھیں۔ رشید رضا کے دلائل کو ڈاکٹر فضل الرحمان نے ایک اور انداز میں بیان کیا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن ان سب کا جواب اس فیصلے میں موجود ہے۔ ان اکادکا نیم سرکاری کوششوں کے باوجود بہت جلد

حکومت پاکستان ۱۹۶۹ء میں اس باب میں یکسو ہوگئی۔۱۹۶۹ کے دسمبر میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے۔اور بینک انٹرسٹ اپنی تمام شکلوں میں حرام ہے۔

کونسل نے یہ بھی تجویز کیا کہ حکومت پاکستان کو ایک پینل قائم کرنا چاہئے جو اس معاملہ میں ضروری سفارشات مرتب کرے کہ بینک انٹرسٹ ختم کرنے کے بعد اس کی متبادل شکلیں کیا کیا ہونی چاہئیں۔اس وقت علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم کونسل کے چیئرمین تھے۔۱۹۷۳ء میں جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم جو پاکستان کے چیف جسٹس رہے تھے۔بلکہ متحدہ پاکستان کے بھی چیف جسٹس تھے وہ اس کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ان کے زمانے میں ایک بار پھر بالاتفاق یہ طے کیا گیا کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے۔

جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم کے دور میں ایک مرتبہ پھر حکومت پاکستان کو یہ تجویز دی گئی کہ وہ ماہرین کا ایک پینل فوری طور پر قائم کرے جو متبادل غیر سودی نظام کا نقشہ تیار کرے۔اس کے جواب میں حکومت پاکستان کے اشارے سے اسلامی نظریاتی کونسل نے ۱۹۷۷ء میں ایک پینل مقرر کیا۔اس پینل میں پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے، اسلامیات کے شعبوں کے نہیں، معاشیات کے تمام شعبوں کے سربراہان شامل تھے۔گویا پاکستان میں جو صف اول کے ماہرین معاشیات تھے وہ سب کے سب اور تمام بڑے بڑے بینکوں کے سربراہان اس کے ارکان مقرر ہوئے۔اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک فاضل رکن اس پینل کے کنویز مقرر ہوئے۔جو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈپٹی گورنر بھی تھے۔گویا اسٹیٹ بینک آف پاکستان بھی اس پورے عمل میں شامل تھا۔اسلامی نظریاتی کونسل بھی اس میں شامل تھی۔پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے معاشیات کے شعبوں کے سربراہ بھی شامل تھے۔پاکستان کے تمام بینکوں کے سربراہان یا ان کے نمائندے بھی اس میں شامل تھے۔اس پینل نے ڈیڑھ یا پونے دوسال مسلسل غور وخوض کیا اور ایک رپورٹ تیار کی۔جس پر اسلامی نظریاتی کونسل نے غور کیا۔جس وقت اسلامی نظریاتی کونسل نے اس رپورٹ پر غور کیا اس وقت بھی کونسل کے مولانا تقی عثمانی صاحب ممبر تھے۔اس وقت مفتی سیاح الدین کا کا خیل بھی ممبر تھے۔اور بھی بہت سے جید علماء کرام کونسل میں شامل تھے۔بلوچستان کے سابق وزیر تعلیم اور ممتاز عالم و مفسر مولانا شمس الحق

افغانی صاحب بھی اس میں موجود تھے۔ان علماء کرام نے اس رپورٹ کو دیکھا،اور اس کی ایک ایک چیز کا جائزہ لے کر اس کو منظور کیا۔اس کو شریعت کے مطابق پایا۔ جہاں جہاں پینل کی تجاویز میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی وہاں تبدیلی کی۔ یہ رپورٹ ربا اور سود کے مسئلہ پر اپنی نوعیت کی پہلی دستاویز ہے جو بنیادی طور پر علماء کرام نے نہیں تیار کی۔ یہ بینکاروں نے اور معاشیات کے ماہرین نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈپٹی گورنر کی نگرانی میں تیار کی۔

اس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے اور اس کے نتیجے میں وہی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں جن کی وجہ سے ربا حرام ہے۔رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ بینک جو جو کام کرتے ہیں ان سب کاموں کو فلاں فلاں طریقوں سے اسلام کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے۔

چناں چہ رپورٹ کے مرتبین نے بینکاری کے تیرہ طریقے تجویز کئے۔ان میں مضاربہ،مشارکہ اور اجارہ اس طرح کی بعض شکلیں تھیں۔ بعد کے سالوں میں ان تیرہ طریقوں پر بہت گفتگو ہوئی اور اس کے تفصیلی احکام پر غور وخوض ہوتا رہا۔ یہ رپورٹ ۱۹۸۰ء کے مارچ میں جاری ہوئی اور دنیا بھر میں مقبول ہوئی۔اس رپورٹ کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا اور سعودی عرب میں شائع ہوا۔اس رپورٹ کا ملائی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس رپورٹ کا اور بھی بعض زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد سے اسلامی بینکاری اور اسلامی معاشیات پر جتنی اہم کتابیں لکھی گئیں۔دنیا میں جتنی تحقیق ہوئی اس میں اس رپورٹ کا حوالہ ضرور دیا گیا۔

اس رپورٹ کے آنے کے بعد حکومت پاکستان نے زور وشور سے کام شروع کیا۔ یہ بات ۱۹۸۱،۱۹۸۲اور ۱۹۸۳ءان تینوں سالوں کی ہے۔ان تین سالوں میں مختلف بینکوں میں کمیٹیاں بنیں۔بعض کمیٹیوں میں مجھے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔بعض کمیٹیوں میں مولانا رفیع عثمانی صاحب بھی تھے۔بعض میں مفتی تقی عثمانی صاحب بھی تھے۔اگر چہ وہ اس وقت جج ہوگئے تھے اس لئے براہ راست کمیٹیوں میں نہیں آتے تھے۔لیکن ان کی راہ نمائی ومشورے سے کام ہوتا تھا۔مولانا محمد طاسین صاحب مرحوم کے بعض خیالات سے لوگوں کو اتفاق نہیں تھا،لیکن ان کی راہ نمائی بھی اس کام میں شامل رہتی تھی۔اور بھی بہت سے حضرات شامل تھے۔

اس مفصل غور وخوض کے بعد یہ طے ہوا اور حکومت پاکستان کے وزیر خزانہ نے جون

۱۹۸۴ میں (وزیر خزانہ اس وقت غلام اسحٰق خان تھے) یہ اعلان کیا کہ اگلے سال یعنی یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے حکومت پاکستان سود کو مکمل طور پر ختم کردے گی۔ اور بینکوں کے تمام معاملات اور تمام کاروبار سو فیصد غیر سودی بنیادوں پر جاری ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں تمام بینکوں میں اسلامی بینکنگ کے شعبے قائم ہوئے۔ بعض شعبوں کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے۔

سب سے زیادہ کام یو بی ایل بینک میں ہوا۔ یو بی ایل بینک میں جو اسلامی بینکنگ کے شعبے کے سربراہ تھے۔ سید نوازش علی زیدی مرحوم ان کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا، وہ بہت فعال اور مخلص انسان تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا مینوئل تیار کیا تھا، جو میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ بہت اچھا مینوئل تھا۔ یعنی بینک کے کارکنان کے لئے ایک ضابطہ کار یا ضابطہ عمل تیار کیا۔ یہ اس بات کا دستور العمل تھا کہ اسلامی خطوط پر بینکوں کے سارے کام کو کیسے چلایا جائے۔ کن دستاویز کے ذریعے چلایا جائے۔ کس طرح کے کاغذات تیار کئے جائیں۔

اس کام کے لئے تمام بینکوں نے جون ۱۹۸۴ء سے بھرپور تیاری شروع کردی، تاکہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء میں جب حکومت پاکستان کا مالی سال شروع ہو جو جولائی سے شروع ہوتا ہے تو سارا کام نئے نظام کے تحت ہونے لگے۔ یکم جولائی ۱۹۸۴ء سے تیاری کی جائے اور یکم جولائی ۱۹۸۵ء میں یہ کام شروع ہو جائے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب ۱۹۸۴ء قریب الختم تھا تو حکومت پاکستان نے ایک بار پھر کہا کہ اگلے سال یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے اس کام کو شروع کریں گے۔

چناں چہ ۱۰ جون ۱۹۸۴ء کو جو مالی سال کے ختم کا مہینہ تھا۔ (اگلے سال سے مُو وا وور یعنی شفٹ اوور کرنا تھا)۔ تبدیلی کا عمل جاری ہونا تھا۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے ایک بہت اہم سرکولر جاری کیا۔ یہ سرکولر نمبر تیرہ ہے جس کی کاپی میرے پاس موجود ہے۔ سرکولر نمبر ۱۳ مجریہ ۱۰ جون ۱۹۸۴ء جاری ہوا۔ جناب صبغۃ اللہ صاحب جو بعد میں اسٹیٹ بینک کے ڈپٹی گورنر ہوئے۔ اس وقت اسٹیٹ بینک کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کے دستخط سے جاری ہوا۔ اس سرکلر میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے یہ ہدایت کی کہ یکم جولائی ۱۹۸۴ء سے تمام بینک اپنے کاروبار کو تبدیل کرنا شروع کردیں گے۔ اور اس ایک سال کے اندر اندر پورے طور پر شفٹ اوور کا کام مکمل کرلیں گے، اور یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے مکمل طور پر اسلامی بینکاری شروع ہو جائے گی۔ پھر کسی کو غیر اسلامی بینکاری کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس حکم نامے میں ان ہی

طریقوں مضاربہ، مشارکہ وغیرہ کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ کس قسم کی فنانسنگ کے لئے کون سا Mode استعمال کیا جائے گا۔ اس ہدایت کی روشنی میں بینکوں نے کام شروع کر دیا۔ اس کے بعد بینکاری کے اس نئے نظام پر یا اس سرکولر پر مکمل عمل درآمد کا آغاز ہونے سے پہلے مارچ ۱۹۸۵ میں انتخابات ہو گئے۔ جمہوریت جس کا ہمارے ملک میں بعض حضرات کو بڑا انتظار تھا اور جس کو دیکھنے کا بہت شوق اور ذوق ہمارے لوگوں میں رہتا ہے وہ نیلم پری بھی آ گئی اور لوگ اس سے بغل گیر ہو گئے۔ ہمارے علمائے کرام بھی اور اسلامی اور دینی جماعتوں کے ارکان بھی، اور اسلامی انقلاب کے نعرے لگانے والے بھی جمہوریت کی اس نیلم پری کے استقبال میں مگن ہو گئے۔ سب اہل دین، اہل جبہ و دستار اور احیائے اسلام کے علمبردار بھی، تجدید کے علم بردار بھی، سب اُس اصلی کام کو بھول گئے، اور جمہوریت کے احیاء کے عمل میں تن من دھن سے مصروف ہو گئے۔ غالب نے کہا ہے نا:

آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

جب میں اس داستان کو بیان کرتا ہوں تو میرے دل میں بھی درد سوا ہوتا ہے، اس لئے میری زبان میں تھوڑی سی تلخی آ جاتی ہے۔ بہ ہرحال ان سب حضرات کی مراد پوری ہو گئی، جمہوریت کی دیوی آ گئی۔ جمہوریت آنے کے بعد جمہوری قائدین نے یہ سرکولر اور یہ ساری پیش رفت جو ہوئی تھی۔ اس کو تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اور بینکوں میں جو کام شروع ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے ختم ہوتا چلا گیا۔ لوگ بھول گئے کہ کس راستے پر کتنا سفر طے کر لیا تھا، کسی نے پوچھا ہی نہیں۔

اس کے تین سال کے بعد جونیجو صاحب کی حکومت برطرف ہو گئی۔ جنرل ضیاء الحق صاحب کو اس پیش رفت کے نہ ہونے بلکہ اس رجعت قہقری کا بڑا احساس تھا۔ انہوں نے کئی بار اس بے عملی پر دکھ کا اظہار بھی کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتے تھے، مجھے نہیں پتہ کہ وہ سچ بولتے تھے یا ان کے ناقدین سچ بول رہے تھے۔ میرے پاس کسی کے دل کی بات جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کون جھوٹ بولتا تھا اور کون سچ۔ مجھ سے تو جو بھی زبان سے کہے گا کہ میں شریعت نافذ کرنا چاہتا ہوں میرے ساتھ تعاون کرو میں اس کے ساتھ تعاون کو تیار ہوں۔ اس کے دل کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ کسی کو لوگوں

کے دلوں تک رسائی ہو یا کسی کو اللہ نے لوگوں کی نیتیں جاننے کا علم دیا ہو تو دیا ہوگا، مجھے نہیں دیا۔

چناں چہ جنرل ضیاء الحق ۲۹ جون ۱۹۸۸ء کو جونیجو صاحب کو برطرف کر دیا۔ اس سے اگلے دن ۳۰ جون ۱۹۸۸ء کو انہوں نے سات آدمیوں کو ملاقات کے لئے بلایا۔ اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، اسٹیٹ بینک کے وہ ڈپٹی گورنر بھی شامل تھے جنہوں نے یہ رپورٹ تیار کی تھی۔ اس وقت کے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئر مین بھی شامل تھے۔ انہوں نے ان حضرات سے یہ کہا کہ پچھلے تین سالوں میں شریعت کے نفاذ کا کام بڑا متاثر ہوا ہے۔ اور آپ نے دیکھا، یہ ہوا، یہ ہوا، اور اس کی تفصیل بتائی۔ پھر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب جو اسٹیٹ بینک کے ڈپٹی گورنر رہ چکے تھے۔ انہوں نے مزید وضاحت کی کہ یہ ہونا چاہئے تھا اور یہ ہونا چاہئے تھا، لیکن نہیں ہوا۔ اس پر جنرل صاحب نے مزید دکھ کا اظہار کیا۔ اور اس کمیٹی سے کہا کہ میرے پاس صرف چار مہینے ہیں۔ انتخابات کرانے تک کی مدت میں، میں ان چار مہینوں میں تین سالوں کی کسر پوری کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ایسی تجاویز دیں کہ جن پر فوری طور پر عملدرآمد کیا جا سکے۔ یہ سات رکنی کمیٹی میری طرف سے مکلف ہے کہ اس کام کو ترجیحی بنیادوں پر کرے انہوں نے مزید کہا کہ جو آپ کہیں گے، وہی کرادوں گا۔ کم از کم اس وقت انہوں نے یہی کہا۔

یہ ۳۰ جون ۱۹۸۸ء کو مغرب کی نماز کے بعد کی بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی معاونت کے لئے اٹارنی جنرل عزیز منشی جو کراچی میں رہتے ہیں اور مشہور وکیل ہیں اور جسٹس ارشاد حسن خان (جو اس وقت وزارت قانون کے سیکریٹری تھے، بعد میں چیف جسٹس آف پاکستان ہوئے۔ چیف الیکشن کمشنر رہے) یہ دونوں آپ کی معاونت کریں گے۔

چناں چہ اس کمیٹی نے کام شروع کیا۔ اور یہ طے کیا کہ کمیٹی چار قسم کے مسودات ان کو تیار کر کے دے گی جن کو وہ فوری طور پر جاری کر دیں گے۔ ایک مسودہ تو فوری طور پر تیار ہوگا جس کا عنوان ہوگا نفاذ شریعت آرڈیننس، دوسرا مسودہ وہ ہوگا جس کے ذریعے تمام ملک میں قاضی عدالتیں قائم کی جائیں گی۔ اور قاضی عدالتوں کے ذریعے لوکل سطح پر تمام معاملات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جائے گا۔ تیسرا مسودہ مالی و معاشیاتی معاملات سے متعلق ہوگا جس میں مالی و معاشی معاملات سے متعلق ان امور کا ذکر کیا جائے گا جن کو فوری طور پر نافذ کیا جا سکتا

ہے۔اور آئندہ طویل المعیاد منصوبے کے طور پر کیا کرنا چاہئے۔اور چوتھا معاملہ یہ تھا کہ تعلیم اور ثقافت سے متعلق بنیادی اصطلاحات تجویز کی جائیں گی۔

چناں چہ اس کمیٹی نے کام شروع کیا۔اب میں اگر اس کی تفصیل میں جاؤں گا تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔مختصر یہ کہ اس کمیٹی نے تیزی سے اپنا کام شروع کیا اور ایک مسودہ تیار کر کے چار پانچ دن کے اندر اندر ان کو دے دیا۔لیکن سچی بات یہ ہے کہ (جنرل صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔اذکروا موتاکم بالخیر)۔انہوں نے بعض معاملات میں اس کمٹمنٹ کی پابندی نہیں کی جو انہوں نے اس کمیٹی سے کیا تھا۔کمیٹی سے کہا تھا جو آپ کہیں گے۔میں اس کو جوں کا توں نافذ کردوں گا۔اور آپ کی مدد کے لئے دو حضرات موجود ہیں۔وہ دونوں حضرات بھی موجود تھے۔ان کو بھی ہم نے ساتھ رکھا۔اور بالآخر جو مسودہ تیار ہوا،اس میں ان دونوں حضرات کی رضا اور مکمل مشاورت بھی شامل تھی۔اس کے باوجود اس مسودے پر سو فیصد عمل درآمد نہیں ہو سکا۔کیا وجہ ہوئی؟ کس نے رکاوٹ ڈالی؟ یہ میں نہیں جانتا۔لیکن اس مسودے میں انہوں نے تبدیلیاں خاصی کر ڈالیں۔اور تبدیلیاں ایسی کیں کہ اس میں جو بنیادی اور موثر چیزیں تھیں وہ نکل گئیں۔اگر چہ جو رہ گیا وہ بھی کافی تھا اور خاصا مفصل تھا لیکن جس طرح سے ہونا چاہئے تھا اس طرح سے نہیں ہو سکا۔

اس کے بعد ہم نے دوسرے مسودے پر کام شروع کیا۔یعنی قاضی کورٹس کے مسودے پر،ان دونوں مسودوں کی ڈرافٹنگ کے بنیادی کام میں،دوسرے حضرات ک ساتھ ساتھ میں بھی پوری سرگرمی سے شریک تھا اس لئے یہ سب تفصیلات میرے ذاتی علم میں ہیں۔قاضی کورٹس کے مسودے کی ڈرافٹنگ پر جب کام شروع کیا گیا تو ان دونوں مشیر حضرات نے بعض معاملات پر کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔عزیز منشی صاحب اور ارشاد حسن خان صاحب نے قاضی عدالتوں کے بعض پہلوؤں پر شدید اعتراضات کئے اور ان کو حکومت کے لئے ناقابل قبول قرار دیا،اس پر مجھے خیال ہوا کہ میں جنرل صاحب سے الگ سے بات کروں اور ملاقات کر کے ان کی رائے معلوم کروں کہ جن دو تین مسائل کے بارے میں یہ ہمیں کہا گیا ہے کہ حکومت کی پالیسی یہ ہے تو وہ خود ہمیں بتائیں کہ ان کی حکومت کی پالیسی کیا ہے؟ چناں چہ میں نے ان سے انفرادی طور پر ملاقات کی جس کا باقی ارکان کو علم نہیں تھا۔ان سے ملاقات کر کے میں نے بتایا

کہ یہ مسودہ ہم نے تیار کیا ہے۔ یہ اس کے بنیادی خدوخال ہیں، اور یہ دو تین چیزیں ہیں جن کے بارے میں لاء سیکریٹری صاحب کا کہنا ہے کہ یہ حکومت کی پالیسی نہیں ہے۔ انہوں نے خان صاحب کی بات سے انکار کیا اور اظہار برأت کیا اور کہا کہ حکومت پاکستان کی پالیسی وہ نہیں ہے جو وہ بتاتے ہیں۔ انہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ بس جنرل صاحب نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ انہوں نے حکومت پاکستان کے موقف کو خود اپنی زبان سے بیان نہیں کیا۔ اس کے بعد اگلے دن یا اس کے اگلے دن ایک میٹنگ بلائی۔ خیر وہ ایک الگ مسئلہ ہے جو اس وقت ہمارے اس موضوع سے باہر ہے۔

جس دن یہ مسودہ ہم نے تیار کرلیا اور یہ مسودہ ایک بار پھر میں نے تفصیل سے پڑھا اور ایک پرائیویٹ ملاقات میں لے جاکر کے ان کو دکھایا۔ اس وقت ایک ایسے سیکریٹری بھی وہاں موجود تھے جو آج بھی حیات ہیں۔ وہ اچھے آدمی ہیں، محب وطن پاکستانی ہیں۔ وہ بھی موجود تھے۔ جنرل صاحب نے میری گفتگو سن کر کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں چند دن کے بعد آپ کو بلاؤں گا۔ یہ آٹھ یا دس اگست کی شام کی بات ہے۔ ۱۴اگست ۱۹۸۸ء کی شام کو پھر ایک تقریب میں انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ بس دو چار روز بعد تفصیل سے ملاقات کریں گے۔ ۱۸اگست کو ان کا انتقال ہوگیا۔ یوں اس کے بعد ان سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

اس کے بعد غلام اسحٰق خان جب تک قائم مقام صدر رہے وہ ان امور میں پوری دل چسپی لیتے رہے۔ اس وقت تک انتخابات نہیں ہوئے تھے۔ (۱۶ نومبر کو انتخاب ہوئے تھے۔ آپ کے علم میں ہوگا)۔ ۱۶ نومبر تک بعض چیزیں انہوں نے تیار بھی کرائیں۔ اور نفاذ شریعت آرڈیننس میں بعض جزوی اصلاحات بھی قبول کیں اور اس کو دوبارہ نافذ بھی کیا۔ لیکن الیکشن کے بعد جو حکومت آئی وہ جن لوگوں کی تھی انہوں نے اس آرڈیننس کو دوبارہ نافذ نہیں کیا اور یہ آرڈیننس چار مہینے کے بعد ختم ہوگیا۔ آرڈیننس کو اگر پارلیمنٹ منظور نہ کرے تو وہ چار مہینے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ چناں چہ یہ آرڈیننس بھی ختم ہوگیا۔

جنرل ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں ایک اور اہم کام ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ انہوں نے وفاقی شرعی عدالت کے نام سے ایک مرکزی عدالت قائم کی تھی۔ یہ عدالت ۱۹۸۰ء میں قائم کی گئی تھی۔ جس کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جس قانون کو قرآن وسنت کے خلاف سمجھے، اس قانون

کومنسوخ کردے۔ بلاشبہ یہ بہت اہم اقدام تھا۔ یہ ان کا سب سے بڑا کام تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیائے اسلام میں بیسویں صدی میں کسی حکمران نے اتنا جراتمندانہ کام نہیں کیا۔ جتنا جنرل ضیاء الحق نے کیا تھا، کہ ایک عدالت کو انہوں نے یہ اختیار دیا کہ میرے نافذ کردہ ہر قانون یا کسی سابقہ قانون کو اگر شریعت سے متعارض پاؤ تو منسوخ کردو۔ لیکن انہوں نے اس میں چار مستثنیات رکھے۔ میری ناچیز رائے میں یہ چار مستثنیات نہیں ہونے چاہئیں تھے۔ ایک تو خود دستور۔ اور اس کی منطق یہ بیان کی کہ دستور کے تحت ہی وفاقی شرعی عدالت قائم ہورہی ہے۔ جس قانون کے تحت وہ عدالت بن رہی ہے، جو قانون اس کی تشکیل کررہا ہے، وہ عدالت اپنے ہی بنانے والے قانون کو کیسے منسوخ کرسکتی ہے۔ یہ بظاہر ایک منطقی بات ہے کہ جو کسی چیز کی پیداوار ہے۔ وہ اپنے وجود میں لانے والے کو کالعدم نہیں کرسکتی۔ لہٰذا دستور میں اگر کوئی چیز شریعت کے خلاف رہ گئی ہے تو اس کے لئے کوئی اور طریقہ کار ہونا چاہئے۔ یہ بات سمجھ میں آتی تھی۔

یوں دستور کا استثنا تھا، عدالتی پروسیجر کا استثنا تھا۔ جس سے ہمارے وکلا حضرات بہت مانوس ہیں اور ان کو یہ بڑا محبوب ہے۔ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے کوئی جج یا کوئی وکیل تیار نہیں ہوتا۔ انگریزی قانون میں یہ دو چیزیں بہت اہم ہیں۔ ضابطۂ دیوانی اور ضابطۂ فوجداری یعنی سول پروسیجر کوڈ اور کریمینل پروسیجر کوڈ۔ ان دونوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اور تیسرا استثنا انہوں نے تین سال کے لئے مالیاتی قوانین کا کیا کہ مالیاتی قوانین تین سال کے لئے اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہوں گے۔ یوں تمام مالیاتی عدالت کے دائرۂ اختیار سے قوانین مستثنیٰ ہوگئے۔ اس کی حکمت عملی یہ بتائی گئی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ مجریہ ۱۹۸۰ء میں ربا کو ختم کرنے کا ایک تین سالہ طریقہ کار تجویز کیا گیا تھا۔ جب اس تین سالہ طریقہ کار کے مطابق ربا ختم ہوجائے گا۔ تو اس وقت پھر ان قوانین کو دیکھنے کی ضرورت پڑے گی، پھر ان میں تبدیلی کی جاسکے گی۔ اس سے پہلے فوری طور پر تبدیلی کرنا مشکل ہے۔ یہ قوانین قبل از وقت منسوخ ہوجائیں گے تو خلا پیدا ہوجائے گا۔ اور متبادل قانون موجود نہیں ہوگا۔ اس کی تیاری نہیں ہوگی اس لئے تین سال کی مدت ہونی چاہئے۔ یہ بات بھی معقول تھی۔

اور چوتھا استثنا انہوں نے رکھا شخصی قوانین کا۔ اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شخصی قوانین میں مسلم فیملی لاء آرڈیننس ہی واحد قانون تھا جس کا تحفظ مقصود تھا۔ یہ قانون جو ایوب خاں بنا گئے تھے۔ ہماری خواتین اور مغرب زدہ طبقہ اس کا بڑا حامی ہے اور اس کو جدت پسندی کا اور جدیدیت کا بڑا مظہر سمجھتا ہے۔ وہ بھی جنرل صاحب نے استثنات کی اس فہرست میں رکھ دیا۔ کیوں رکھا؟ اس کی حکمت میری سمجھ میں نہیں آئی۔

بہ ہرحال ان چار اہم بلکہ بنیادی مستثنات کے ساتھ یہ اختیار انہوں نے وفاقی شرعی عدالت کو دے دیا۔ وفاقی شرعی عدالت نے اس اختیار کے تحت بہت سارے قوانین کا جائزہ لیا۔ اور بہت سارے قوانین کو کالعدم قرار دیا اور آہستہ آہستہ ایک تبدیلی قانون سازی کے عمل میں آنی شروع ہوگئی۔

ان فیصلوں کے خلاف اپیل سننے کے لئے سپریم کورٹ میں ایک شریعت اپلیٹ بنچ قائم کیا گیا، جس میں ایک طویل عرصے تک مولانا تقی عثمانی اور پیر کرم شاہ صاحب ممبر رہے۔ ان کے ساتھ تین دوسرے جج صاحبان بھی تھے۔ یہ پانچ رکنی بینچ تھا، جو طویل عرصے کام کرتا رہا اور اب بھی کام کر رہا ہے۔

جب تین سال کے استثنا کی یہ مدت پوری ہونے کے قریب آئی تو جنرل ضیاء الحق صاحب نے ایک ترمیم کے ذریعے اس کو پانچ سال کر دیا۔ جب پانچ سال پورے ہونے لگے تو پانچ کو بڑھا کر سات کیا، جب یہ سات سال بھی پورے ہونے لگے تو ترمیم کر کے دس سال کر دیئے۔ ترمیم کا یہ اختیار جنرل صاحب کو بہ طور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حاصل تھا اور چلا آرہا تھا۔ ملک میں ان کے حکم کے ذریعے دستور معطل تھا اور پورے ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ وہ جس طرح چاہتے تھے دستور میں ترمیم کر سکتے تھے۔ جب یہ آخری ترمیم انہوں نے دس سال کی کردی اس کے کچھ عرصے بعد مارشل لاء ختم ہوگیا۔ اب مزید ترمیم نہیں ہوسکتی تھی۔

دستور میں ترمیم کا طریقہ کار یہ ہے کہ صدر کی اجازت سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی دو دو تہائی اکثریت اس میں ترمیم کر سکتی ہے۔ صدر اجازت دے اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوان دو دو تہائی اکثریت سے ترمیم کریں تو دستور کی کسی دفعہ میں ترمیم ہوسکتی ہے، ورنہ نہیں۔ اس وقت یعنی ۱۹۸۸ء کے بعد کے سالوں میں، دو تہائی اکثریت پارلیمنٹ میں کسی کو حاصل

نہیں تھی۔ جن لوگوں کی حکومت تھی ان کو بھی حاصل نہیں تھی اور اپوزیشن کو بھی حاصل نہیں تھی۔ میں نے سنا ہے (مجھے یقین نہیں ہے، ذاتی اطلاع نہیں ہے، لیکن سنا ہے، شنید تھی) کہ حکومت وقت نے ترمیم کر کے وفاقی شرعی عدالت کے اس اختیار کو ختم کرنا چاہا، لیکن اس وقت کی اپوزیشن اس ترمیم کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ بعد میں جب اس وقت کی اپوزیشن حکومت میں آئی تو اس نے وہی ترمیم کرنا چاہی تو جو پہلی حکومت کرنا چاہتی تھی وہ اب اپوزیشن میں تھی۔ اب اس نے اجازت نہیں دی۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کو مشکل میں ڈالنے کے لئے شریعت کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ گویا زبان حال سے کہتے تھے کہ اب مشکل میں آئے ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے نمٹتے ہو۔ بہ ظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اپنے اپنے زمانے میں ترمیم کرنا چاہتے تھے لیکن عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد۔ اس کی وجہ سے ترمیم نہیں ہو سکی اور دس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد ۱۹۹۰ء میں یہ قوانین وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار میں آگئے۔ یہ دس سال کی مدت ۲۴ جون ۱۹۹۰ء کو پوری ہوگئی۔

۲۴ جون ۱۹۹۰ء کو جب وفاقی شرعی عدالت کے یہ اختیارات بہ حال ہوگئے تو وفاقی شرعی عدالت کے روبرو ایک سو تیرہ درخواستیں دائر ہوگئیں۔ ایک سو تیرہ درخواستوں میں کچھ افراد کی تھیں، کچھ بینکوں کی تھیں، کچھ دوسرے مختلف اداروں کی تھیں۔ ان ایک سو تیرہ درخواستوں کی سماعت جون ۱۹۹۰ء سے وفاق شرعی عدالت نے شروع کر دی۔ یہ سماعت وقفہ وقفہ سے نومبر ۱۹۹۱ء تک یعنی تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہی۔ ۱۶ نومبر ۱۹۹۱ء کو وفاقی شرعی عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ جس میں ان ساری عرض داشتوں اور پٹیشنوں کو قبول کر لیا گیا تھا اور بینک انٹرسٹ کو ربا قرار دیا گیا تھا اور پاکستان کے ۲۲ قوانین کی مختلف دفعات کو اور کچھ قوانین کو کلی طور پر کالعدم قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ بڑا بنیادی اور اہم فیصلہ تھا۔ بڑا مفصل فیصلہ تھا۔

اگرچہ اس فیصلے کے بارے میں میرے کئی ذاتی ملاحظات ہیں۔ میری ذاتی رائے میں وہ فیصلہ مزید بہتری کا اور نظر ثانی کا محتاج تھا۔ اس میں بعض خامیاں رہ گئی تھیں۔ یہ فیصلہ جلدی میں لکھا گیا، یا لکھنے کے بعد نظر ثانی نہیں ہوئی۔ کیا وجہ ہوئی؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا، تاہم یہ میری ذاتی رائے ہے۔ ایک سابق جج کی حیثیت سے یہ میری رائے ہے۔ بہ طور ایک سابق جج کے

رائے ظاہر کرنے کا، کم ازکم مجھے اختیار ہے۔ اس لئے اس میں توہین عدالت کوئی نہیں ہے۔

ان ذاتی ملاحظات کے باوجود یہ ایک انتہائی تاریخی فیصلہ تھا اور بہت اہم فیصلہ تھا۔ اس وقت حکومت پاکستان پر یہ زور ڈالا گیا کہ وہ اس فیصلے کو فوراً جوں کا توں قبول کرلے اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہ کرے۔ واضح رہے کہ اس وقت آئی جے آئی کی حکومت تھی۔ آئی جے آئی کی حکومت اس اعلان اور نعرے کے ساتھ برسر اقتدار آئی تھی کہ ہم ملک میں شریعت نافذ کریں گے اور تمام اسلامی جماعتیں یا بڑی بڑی اسلامی جماعتیں اس میں شامل تھیں۔ جماعت اسلامی بھی اس میں شامل تھی۔ اور یہ اعلان فضا میں گونج رہا تھا کہ ہم شریعت لے کر آئیں گے۔ انہوں نے اس فیصلے سے چند ماہ قبل ایک لولا لنگڑا شریعت ایکٹ بھی نافذ کر دیا تھا۔

لہٰذا بہت سے مبصرین کا بجا طور پر خیال یہ تھا کہ یہ تو ان لوگوں کی اپنی حکومت ہے جو خود نفاذ اسلام کے قائل ہیں، یہ اس کے خلاف اپیل نہیں کریں گے۔ چناں چہ توقع یہی تھی کہ اپیل نہیں کی جائے گی، لیکن حکومت کے ذمے دار حضرات نے اپیل کرنے پر اصرار کیا۔ اور اصرار جن جن وجوہات سے کیا وہ وہی ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا کہ فیصلے میں بعض ایسے خلا یا کمزوریاں رہ گئیں تھیں جس کی وجہ سے بعض معاملات واضح نہیں تھے۔ یہ بات باقی جج صاحبان یا جو فاضل حضرات فیصلہ لکھ رہے تھے ان کے غور کرنے کی تھی۔

وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اگر اپیل نہ کی جائے تو وہ ملک کا قانون بن جاتا ہے اور قطعی اور حتمی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے بعد کسی کو اس کے خلاف کوئی اقدام یا فیصلہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر اپیل کر دی جائے تو پھر سپریم کورٹ کا جو بھی فیصلہ ہو وہ حتمی ہوتا ہے۔ چناں چہ اپیل کی مدت میں جب تین چار دن رہ گئے تو حکومت نے اپیل دائر کردی۔ یہ اپیل جون ۱۹۹۲ء میں یا مئی ۱۹۹۲ء میں دائر ہوئی۔ ۱۹۹۲ء سے لے کر یہ اپیل زیر التواء رہی۔ ۱۹۹۸ء تک کے اس اس طویل عرصے میں کسی نے اس کی خبر نہ لی، نہ حکومت نے نہ کسی ''اسلامی'' جماعت نے، نہ خود سپریم کورٹ نے۔

اکتوبر ۱۹۹۸ء میں سپریم کورٹ نے دوبارہ اس کو ٹیک اپ کیا۔ اس کی زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت اس بات کے شواہد محسوس ہوتے تھے کہ حکومت پاکستان اس

وقت یہ نہیں چاہتی کہ اپیل کی سماعت ہو۔اس ضمن میں سیاست بھی بہت چلی۔کسی نے حکومت کومشورہ دیا کہ آپ سپریم کورٹ سے اپیل Withdraw کر کے وفاقی شرعی عدالت میں نظر ثانی کی اپیل دائر کردیں۔ چناں چہ حکومت نے اس وقت ایک اسٹیج پر یہ اعلان کیا کہ ہم نے اپیل واپس لے لی ہےاور نظر ثانی کی اپیل دائر کررہے ہیں۔اب یہ مشورہ فنی اعتبار سے بہت کم زور، بلکہ غلط تھا۔یہ مشورہ کس نے دیا تھا؟ بہ ظاہر فنی امور سے وہ ناواقف ہوگا،اس لئے کہ نظر ثانی کی مدت گزر چکی تھی، آٹھ سال گزر چکے تھے۔فنی طور پر جیسے ہی اپیل واپس ہوئی تو وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ موثر ہو جانا چاہئے۔ وہ موثر ہوگیا تو اب اپیل پرنظر ثانی کی بھی گنجائش نہیں۔اب تو حکومت کی ذمے داری ہے کہ اس پر عملدرآمد کرے۔آج سے ہی عمل درآمد شروع ہوجائے گا۔

جب یہ بات ارباب حکومت کو بتائی گئی تو وہ بڑے گھبرائے۔انہوں نے تردید کی کہ ہم نے اپیل واپس نہیں لی تھی۔ جب اس کا دستاویزی ثبوت بھی اخبارات میں آگیا کہ آپ نے اپیل واپس لے لی ہے۔تو شنید یہ ہے کہ جاکر رجسٹرار کی منت ساجت کی اور چاہا کہ سپریم کورٹ یہ کہہ دے کہ حکومت نے واپسی کی درخواست تو دی تھی۔لیکن سپریم کورٹ نے اجازت نہیں دی۔ چناں چہ یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ ہم نے درخواست تو دی تھی لیکن سپریم کورٹ نے اجازت نہیں دی۔

جب سماعت شروع ہوئی تو سرکاری کارندوں سے یہ پوچھا گیا کہ کیا آپ نے اپیل کی واپسی کی درخواست دی تھی۔اگر درخواست دی تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اپیل کی سماعت نہیں چاہتے، آپ نہیں چاہتے کہ اپیل سنی جائے۔اگر نہیں چاہتے تو پھر اپیل کے سننے کی ضرورت نہیں۔سابقہ فیصلہ خود بہ خود موثر ہوجائے گا۔ وہ اس کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ چناں چہ اپیل کی سماعت شروع ہوگئی۔اپیل کی جب باقاعدہ سماعت شروع ہوئی تو حکومت پاکستان کا کوئی نمائندہ وہاں اپنی بات کہنے کے لئے موجود نہیں تھا۔اس اپیل کی سماعت نومبر ۱۹۹۸ء کی کسی آخری تاریخ سے یا دسمبر ۱۹۹۸ء کی کسی ابتدائی تاریخ سے جاری رہی۔اور چار جولائی ۱۹۹۹ء تک جاری رہی۔اس وقت تک حکومت پاکستان کا سرکاری موقف پیش کرنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔

بعض لوگوں کو عدالت نے پرائیویٹ طور پر بلایا۔ایک ڈپٹی اٹارنی جنرل جو شریعت بینچ کے روبہ رو کام کرنے کے لئے مامور تھے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ حکومت کا موقف بیان کریں۔انہوں نے کہا کہ میرے پاس حکومت کی طرف سے کوئی ہدایات نہیں ہیں۔اور ایک دوسرے سرکاری وکیل پیش ہوں گے۔ وہ سرکاری وکیل پیش ہوئے تو انہوں نے کہا کہ میں سردست اس کے لئے تیار نہیں ہوں آپ مجھے مدت دیں۔

عدالت نے کہا کہ آٹھ سال سے یہ معاملہ معلق ہے۔اور اب چار مہینے سے تقریباً مسلسل سماعت ہو رہی ہے، آپ کو نوٹس بھی جا چکا ہے؟ تو آپ کیوں تیار نہیں تھے؟۔انہوں نے کہا کہ میں تیار نہیں ہوں۔اس پر انہوں نے کہا کہ مجھے ایک دن کی مہلت دے دیں، وہ دن چھٹی کا دن تھا اس سے اگلے دن کی آپ مجھے مہلت دیں تاکہ میں حکومت پاکستان کا موقف بیان کرسکوں۔

آخری دن عدالت بیٹھی، میں اس میں موجود تھا۔میں چشم دید اور ذاتی معلومات آپ کو بتا رہا ہوں۔عدالت بیٹھی تو وہ صاحب جو یہ کہہ کر گئے تھے کہ میں حکومتِ پاکستان سے ہدایات لے کر آؤں گا وہ نہیں آئے۔عدالت کے بینچ نے کوئی دو گھنٹے انتظار کیا۔اس کے بعد بھی سماعت ختم کرنے کا اعلان نہیں کیا، اس لئے کہ سماعت بند کرنے کے بعد مزید سماعت نہیں ہوسکتی۔ عدالت برخاست کر دی گئی اور یہ کہہ دیا گیا کہ اگر حکومت پاکستان اپنے موقف کو پیش کرنا چاہے تو اپنا موقف پیش کرسکتی ہے۔اس وقت سے لے کر ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء تک حکومت پاکستان نے اپنا موقف سرکاری یا غیر سرکاری طور پر پیش نہیں کیا۔

اسی اثنا میں ۱۲ اکتوبر کو وہ حکومت ختم ہوگئی۔نئی حکومت آ گئی۔نئی حکومت نے بھی اپنا موقف پیش نہیں کیا، شاید ان کو اس کا علم ہی نہیں تھا کہ یہ اہم معاملہ سپریم کورٹ کے روبرو زیر غور ہے۔تا آں کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو سپریم کورٹ کے فل بینچ نے مکمل فیصلہ دے دیا۔جس کی رو سے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا گیا۔بعض چیزوں کے بارے میں مزید احکامات دیئے گئے اور ایک تفصیلی حکم نامہ دیا گیا۔جس کے تحت ایک قانون تو فوری طور پر منسوخ ہوگیا اور پانچ قوانین ۲۳ مارچ ۲۰۰۰ء سے منسوخ ہوگئے۔دو قوانین ۳۰ جون ۲۰۰۰ء سے منسوخ قرار پائے۔

بقیہ قوانین کے بارے میں ترامیم کا حکم دیا گیا۔ اور ایک تفصیلی ہدایت نامہ دیا گیا کہ حکومت پاکستان فلاں فلاں اقدامات کرے۔ اس تفصیلی ہدایت نامہ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ حکومت پاکستان اسٹیٹ بینک میں ایک کمیشن قائم کرے جو ان تمام مدارج اور مراحل سے ایک ایک قدم کا پورے طور پر جائزہ لے جو اٹھائے جانے چاہئیں۔ بینکوں کو اور مالیاتی اداروں کو کیا کیا کرنا چاہئے، اور اس کی نشان دہی کرے کہ کس تاریخ کو کس مہینے میں کیا اقدام کرنا ہے۔

چناں چہ یہ کمیشن قائم کیا گیا۔ اسٹیٹ بینک کے سابق گورنر امتیاز عالم حنفی اس کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ مولانا رفیع عثمانی صاحب بھی اس کے ممبر تھے۔ اور بھی بہت سے حضرات ممبر تھے۔ اس کمیشن نے کئی مہینے بڑے زور شور سے اور بہت اخلاص کے ساتھ کام کیا اور دل جمعی اور سنجیدگی کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے پوری رپورٹ تیار کر دی۔[۱] اس کی کاپی میرے پاس بھی موجود ہے، یہ ایک بہت بڑی ضخیم رپورٹ ہے۔ ایک ایک ضروری چیز کے بارے میں کمیشن نے رائے دے دی ہے، اور پوری ایک تحقیقی کتاب مرتب کر دی ہے۔ یوں ایک بہت قیمتی اور قابل قدر دستاویز انہوں نے تیار کر کے دے دی۔ اس کی مثال دنیائے اسلام میں کسی سرکاری کاوش میں یا کہیں اور نہیں ملتی۔ اگر یہ رپورٹ شائع ہو جائے تو بہت سے اہلِ علم اس سے استفادہ کر سکیں گے۔

سپریم کورٹ نے مزید یہ بھی حکم دیا کہ وزارت قانون ایک ٹاسک فورس بنائے جس کا کام یہ ہو کہ وہ ۲۲ قوانین جن کو منسوخ کیا گیا ہے ان کے متبادل قوانین کے مسودے تیار کئے جائیں۔ اور نئے وہ قوانین بھی تیار کئے جائیں جو نفاذ اسلام کے لئے ضروری ہیں، مثلاً مالیات کے معاملے میں اور حرمت ربا کے لئے ضروری ہیں۔ اس ٹاسک فورس کا چیئرمین حکومت پاکستان نے مجھے مقرر کر دیا۔ میرے ساتھ وزارت خزانہ کے لوگ بھی تھے وزارت قانون کے لوگ بھی تھے۔ بعض دیگر ماہرین بھی تھے۔

اس ٹاسک فورس نے جنوری ۲۰۰۰ء سے کام شروع کر دیا۔ اور ان تمام قوانین کو جو منسوخ کئے گئے ان کے متبادل قوانین کے مسودے بنا دیئے۔ جن قوانین میں ترامیم کرنی تھیں۔ ان تمام ترامیم کے مسودے تیار کر دیئے۔ جو نئے قوانین ڈرافٹ کرنے تھے۔ وہ

سارے قوانین ڈرافٹ کر کے تیار کر دیئے۔

ایک اسٹیج پر ٹاسک فورس نے یہ طے کیا کہ اسٹیٹ بینک کے کمیشن سے بھی رابطہ ہونا چاہئے۔ چناں چہ ہم نے کئی مشترکہ اجتماعات بھی کئے۔ میں خود اسٹیٹ کی بینک کی میٹنگ میں کئی بار شریک ہوا۔ یوں ہم نے اتفاق رائے سے سب قوانین کے مسودے تیار کر لئے۔ یہ رپورٹ میں نے مکمل طور پر تیار کر کے حکومت پاکستان کو دے دی۔

دوسری طرف ابھی یہ رپورٹ تیار نہیں ہوئی تھی کہ حکومت پاکستان نے سپریم کورٹ میں ایک درخواست دائر کی جس میں یہ کہا گیا کہ جو حتمی تاریخ آپ نے فیصلے کے حتمی طور پر موثر ہونے کی قرار دی ہے یعنی ۳۰ جون ۲۰۰۱ء اس میں ایک سال کی توسیع کر دی جائے۔ اس وقت اس بینچ نے جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے اس توسیع کی درخواست کو قبول کر لیا۔ کیوں قبول کر لیا؟ میں نہیں جانتا۔ میری ذاتی رائے میں یہ توسیع بالکل نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اس کی بہ ظاہر قانون میں بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بہ ہر حال عدالت نے ایک سال کی توسیع کر دی۔ اب یہ مدت ۳۰ جون ۲۰۰۲ء قرار پا گئی۔

۳۰ جون ۲۰۰۲ء سے چند ہفتے پہلے ایک نوٹیفکیشن جاری ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ مولانا تقی عثمانی صاحب اب سپریم کورٹ کے جج نہیں رہے۔ بنچ کا ایک رکن پہلے ہی استعفیٰ دے چکا تھا۔ ان دونوں ارکان کی جگہ دو حضرات کو جن میں سے ایک ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، دوسرے مشہور مناظر علامہ خالد محمود صاحب تھے جج مقرر کر دیا گیا۔ ان دونوں نے شریعت بنچ کی رکنیت کا حلف اٹھایا، چند روز بعد اس بینچ نے بہت مختصر سی سماعت کے بعد جو غالباً گھنٹے بھر سے بھی کم جاری رہی عدالت کے فیصلے کو واپس لے لیا اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا اور مسئلے کو دوبارہ وفاقی شرعی عدالت میں بھیج دیا۔ یوں عدالت کی حد تک تو معاملہ روز اول پر چلا گیا۔ جو کام ہوا تھا ۱۹۹۰ء سے لے کر اور ۲۰۰۲ء تک جو پیش رفت ہوئی تھی وہ صفر ہو گئی اور وہ سارے کا سارا کام کالعدم ہو گیا۔

لیکن یہ جو علمی کام ہوا تھا اس کے اثرات اپنی جگہ بڑے نمایاں طور پر سامنے آئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ فیصلہ ہوا تھا۔ اور اس پر عملدرآمد آہستہ آہستہ ہو رہا تھا اس وقت لوگوں کی دل چسپی اس کام میں برائے نام تھی۔ لیکن جب یہ فیصلہ کالعدم ہو گیا تو اچانک بلاسود

بینکاری میں لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی۔ کیسے بڑھ گئی؟ کیوں بڑھ گئی؟ اللہ تعالی نے دل میں ڈالا؟ اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے اس کے کیا اسباب ہیں؟ مجھے نہیں معلوم!۔

اس دل چسپی بڑھنے کے نتیجے میں جگہ جگہ اسلامی بینکاری کے لئے سیمینار منعقد ہونے شروع ہوگئے ،لوگوں نے گفتگوئیں کرنا شروع کردیں۔ مذاکرے شروع ہوئے ،اور بہت سے کاروباری لوگوں نے از خود یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے کاروبار کو شریعت کے مطابق ڈھالنا چاہیں گے۔اس پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سابق گورنر ڈاکٹر عشرت حسین نے بھی بعض ضروری اقدامات کئے اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ اسٹیٹ بینک کے مخلص ترین گورنروں میں سے تھے۔انہوں نے اسلامی بینکاری کے لئے بڑے اخلاص سے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، میں عنداللہ اور عندالناس اس کی گواہی دینے کے لئے تیار ہوں۔انہوں نے خود بھی جو جو فیصلے کئے وہ بہت مناسب فیصلے تھے۔

انہوں نے اسٹیٹ بینک کو فنی اعتبار سے بھی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا۔ اور اسلامی بینکاری کے لئے بھی بہت اہم اور مفید فیصلے کئے۔ایک فیصلہ انہوں نے ذاتی طور پر بڑا جرأت مندانہ کیا، وہ ابھی تک تو قائم ہے۔آئندہ قائم رہے گا یا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا۔انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ پاکستان میں کسی کنونشنل بینک کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔کوئی کنونشنل یعنی سودی بینک نہ نیا پاکستان میں قائم ہوگا۔نہ باہر سے آنے والے کسی سودی بینک کو یہاں کام کرنے کی اجازت ہوگی۔آئندہ جو بینک قائم کئے جائیں گے وہ صرف اسلامی بینک ہوں گے۔اس کے لئے انہوں نے ایک لیگل فریم ورک جاری کیا۔ایک قانونی ڈھانچہ جاری کیا جو اس نئی پالیسی کو روبہ عمل میں لانے میں استعمال کیا جائے گا۔اس نئی پالیسی کے تحت انہوں نے تین فیصلے کئے۔

ایک فیصلہ یہ کیا کہ اگر کوئی موجودہ بینک اپنی کسی برانچ کو اسلامی برانچ میں تبدیل کرنا چاہے،تو وہ اس فریم ورک میں بیان کردہ قواعد کے مطابق ایسا کرسکتا ہے۔اس کے لئے یہ اور یہ قواعد ہوں گے۔اگر کوئی موجودہ بینک اپنے کو مکمل طور پر تبدیل کرکے اسلامی بینک بنانا چاہے تو اس کے قواعد یہ ہوں گے۔

اور اگر کوئی موجودہ بینک اپنی کوئی سبسڈی، یعنی کوئی ذیلی ادارہ بنانا چاہے جو غیر سودی

بنیادوں پر کام کرنا چاہے اس کی بھی اجازت ہوگی۔ وہ سبسڈی جس کی پہلے بینک مخالفت کرتے تھے کہ نہیں ہو سکتی، اور کہا کرتے تھے اس سے بینکنگ اپنے دائرہ کار سے نکل جائے گی۔ لیکن اب خود اسٹیٹ بینک نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ اس پورے کام کی نگرانی اور شرعی راہ نمائی کے لئے اسٹیٹ بینک نے ایک شریعہ بورڈ قائم کیا۔ اسٹیٹ بینک کے گورنر عشرت حسین صاحب نے جن سے میرا تعارف اس زمانے سے تھا مجھ سے باصرار کہا کہ تم اس کی سربراہی قبول کرلو۔ میں نے قدرے تامل کے بعد بعض باصیرت احباب کے مشورے سے اس بورڈ کی سربراہی قبول کرلی۔

اس بورڈ کی ذمے داری یہ ہے کہ اس نئی پالیسی کی روشنی میں بلاسود بینکنگ کا جو بھی کام ہو اس کے لئے شرعی قواعد وضع کرے۔ ان قواعد پر عملدرآمد کی رفتار پر نظر رکھے، اس کے لئے جہاں ضروری ہو مناسب قواعد و ہدایات جاری کرے۔ میں نے ڈاکٹر عشرت حسین صاحب سے یہ بھی طے کروایا تھا کہ اس بورڈ کے جو بھی فیصلے ہوں گے وہ شرعی معاملات میں حتمی اور قطعی ہوں گے اور کسی کو بھی ان میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہوگی۔

حتیٰ کہ خود اسٹیٹ بینک کے لئے بھی وہ لازمی اور بائنڈنگ ہوں گے۔ اسٹیٹ بینک کا کوئی ضابطہ بورڈ کے شرعی فیصلوں کو کالعدم نہیں کر سکے گا۔ اختیار اس بورڈ کو حاصل ہے۔ اس بورڈ نے یہ کیا کہ سب سے پہلے رائج الوقت اسلامی طرق سرمایہ کاری یعنی مضاربہ، مشارکہ وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے قواعد نامہ تیار کیا جس میں بنیادی کام اس کمیشن نے کیا تھا جس کے سربراہ حنفی صاحب تھے۔ وہ اس بورڈ نے نظر ثانی کے بعد نافذ کردیا۔ اب تمام بینک جو مشارکہ یا مضاربہ کریں گے وہ انہی احکام کی بنیاد پر کریں گے۔

دوسرا کام اس بورڈ نے یہ کیا کہ وہ انسٹرومنٹس یعنی وہ دستاویزات جو ان کاموں کے لئے درکار ہیں وہ دستاویزات منظور کرکے نوٹیفائی کردیں اور یہ طے کردیا کہ اب صرف ان ہی دستاویزات کی بنیاد پر یہ کام ہوگا۔ ان کے علاوہ ان سے متعارض کوئی دستاویزات ہوں گی تو ان کی بنیاد پر اسلامی بینکاری کا کام نہیں کیا جا سکے گا۔

تیسرا کام اس بورڈ نے یہ کیا کہ ہر اسلامی بینک یا برانچ یا سبسڈی کے لئے لازمی قرار دیا کہ وہ اپنے ہاں یا ایک شریعہ کمیٹی بنائے یا کم از کم ایک شریعہ ایڈوائزر مقرر کرے۔ اور ہر اہم

معاملہ، کاروبار اور جملہ اہم اور بنیادی دستاویزات شریعہ ایڈوائزر یا شریعہ کمیٹی کی منظوری سے جاری ہوں، اور جو شریعہ ایڈوائزر حکم دے اس کے مطابق یہ کام کرنا لازمی ہوگا۔

شریعہ ایڈوائزر کے لئے ہدایت یہ ہے کہ شریعت کے جو احکام منصوص اور طے شدہ ہیں جن میں کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، وہاں تو وہ ان ہی احکام پر عمل درآمد کرائے۔ جہاں جہاں جن امور میں اختلاف رائے ہے، کسی معاملے میں دو رائے ہیں، دور جدید کے فقہا کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، تو وہاں وہ شریعہ بورڈ کے فیصلے کا پابند ہوگا۔ اس طرح کے اختلافی امور میں شریعہ بورڈ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ اگر کسی معاملے میں شریعہ ایڈوائزر کو کوئی شک یا تامل ہو تو وہ شریعہ بورڈ سے رجوع کرے اور شریعہ بورڈ سے اس میں راہ نمائی یا مشورہ لے اور پھر اس کے مطابق کام کرے۔

شریعہ ایڈوائزر کے لئے بھی ہم نے طے کیا کہ شریعہ ایڈوائزر وہ آدمی ہوگا جو کسی مستند دینی ادارے سے درس نظامی کی سند رکھتا ہو، فقہ میں تخصص کر چکا ہو، اس کے علاوہ پہلے ہم نے صرف یہ رکھا تھا کہ بہ قدر ضرورت بینکاری کے نظام کو سمجھتا ہو۔ لیکن گزشتہ دو تین سال کے تجربے سے پتہ چلا کہ محض یہ شرط کافی نہیں ہے۔ کئی ایسے حضرات کا بہ طور شریعہ ایڈوائزر مختلف بینکوں میں تقرر ہو گیا جو بینکنگ کے معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا اپنا خیال تھا کہ وہ بینکاری کے معاملات کو سمجھتے ہیں۔ لیکن آگے جا کر پتہ لگا کہ جس سطح پر سمجھنے کی ضرورت ہے، اس سطح پر نہیں سمجھتے۔ مثلاً انگریزی نہیں جانتے تھے۔ یا انگریزی بہت کمزور تھی جس کی وجہ سے ان کو بینکوں کی دستاویزات کو سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ اب ہم نے پچھلی میٹنگ میں یہ شرط کر دی ہے کہ شریعہ ایڈوائزر ان صلاحیتوں کے ساتھ بی اے پاس ہوں اور اکنامکس کو مضمون کے طور پڑھ چکے ہوں اور انگریزی زبان میں کم از کم پڑھنے میں رواں ہوں، اس کے بغیر وہ کام نہیں کر سکیں گے، یا وہ اسلامی یونیورسٹی سے شریعہ میں ایل، ایل، ایم کی ڈگری رکھتے ہوں یا اسلامی معاشیات، یا اسلامی بینکنگ میں ماسٹرز کی ڈگری رکھتے ہوں۔ ان تین شرائط میں سے کسی ایک شرط پر جو لوگ پورے اترتے ہوں گے، وہ شریعہ ایڈوائزر مقرر کئے جائیں گے۔

اس وقت (۲۰۰۴ء کے اواخر میں) پاکستان میں تقریباً ۱۴ مکمل یا نامکمل اسلامی برانچیں قائم ہیں۔ آٹھ دس کی درخواستیں مزید زیر غور ہیں۔ بعض بڑے بڑے اسلامی بینک بھی میدان

میں آئے ہیں۔دبئی اسلامک بینک نے زور و شور سے اپنا کام شروع کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ وہ پانچ ارب ڈالر کا سرمایہ یہاں لے کر آئیں گے۔پانچ ارب ڈالر کا سرمایہ بہت بڑی رقم ہے۔پاکستان کے لئے یہ بہت بڑی رقم ہے۔اتنی بڑی رقم ہے کہ آپ کو اندازہ کرنے کے لئے بتا تا ہوں کہ حکومت پاکستان نے آج سے کافی پہلے یہ جو فیصلہ کیا تھا (جو میرے خیال میں انتہائی نامناسب اور غلط بلکہ ملک کی معاشی خودمختاری اور سیاسی آزادی کے لئے تباہ کن تھا) کہ ہم اپنے بعض موجود اثاثہ جات اور جائیدادوں کو بیچ کر پرائیویٹائز کر دیں گے۔اس کے تحت حکومت کے بہت سارے Assets اور اثاثے بیچے جا رہے ہیں۔پرائیویٹائزیشن کمیشن نے جن Assets کی فہرست بنائی ہے جنہیں بیچ دیا جائے گا اور بہ قول ان کے حکومت پاکستان کے خزانہ سے ان کا بوجھ اتر جائے گا وہ سارے کے سارے حکومت پاکستان کے اندازے کے مطابق اچھے نرخ پر بک جائیں تو ان کی قیمت چار ارب ڈالر بتائی جاتی ہے۔ٹوٹل چار ارب ڈالر قیمت ہوگی جس کی خاطر یہ سارے انتہائی قیمتی اثاثے بیچے جا رہے ہیں۔اور اونے پونے بیچے جا رہے ہیں اور ان میں سے بعض کی تفصیلات بھی اخباروں میں آتی رہتی ہے۔

دبئی اسلامی بینک کے ذمے دار حضرات پانچ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری اسلامی بینکنگ کے لئے پاکستان میں لے کر آنے کے وعدے کے ساتھ آرہے ہیں۔اس سے اندازہ کرلیں کہ اسلامی بینکنگ میں کتنی گنجائش اور کتنی وسعت ہے۔ظاہر ہے کہ بینک تو کاروبار کرنے کے لئے آتا ہے۔وہ دعوت وتبلیغ کے لئے نہیں آتا۔جنہوں نے وہ بینک بنایا ہے انہوں نے وہ بینک کسی دعوت یا تبلیغ کے لئے نہیں بنایا۔بلاشبہ وہ اچھے لوگ ہیں،مخلص لوگ ہیں۔لیکن ان کا اصل مقصد کاروبار اور بزنس ہے۔اسی طرح بہت سے روایتی بینکوں نے اپنی سبسڈیز بنانی شروع کر دی ہیں۔وہ مختلف انداز کی سبسڈیز قائم کر رہے ہیں لیکن اصل رکاوٹیں وہی تین چار ہیں جو میں نے عرض کی ہیں۔

تاہم ایک اہم مسئلہ اب بھی یہی ہے کہ ہر بینک زیادہ سے زیادہ مرابحہ پر کام کرنا چاہتا ہے۔مشارکہ،مضاربہ کی طرف بینکاری سے وابستہ لوگ آنا نہیں چاہتے۔وہ اس کے راستے میں رکاوٹیں بتاتے ہیں۔بینکوں سے بات کی جائے تو وہ حکومت کی شکایت کرتے ہیں۔حکومت کے ذمہ داروں سے بات کی جائے وہ بینکوں کی شکایت کرتے ہیں۔اسٹیٹ بینک

سے بات کی جائے تو وہ وزارت خزانہ پر ڈال دیتے ہیں۔وزارت خزانہ سے بات کی جائے وہ اسٹیٹ بینک کا دکھڑا بیان کرنے لگتے ہیں۔ میں ادھر ادھر لوگوں کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہوں۔ذمے دار لوگوں سے بات کرتا رہتا ہوں۔جتنی مرتبہ بھی وہ کہیں گے، جہاں بھی بات کرنے کے لئے کہیں گے ان شاء اللہ وہاں کوشش کرنے میں تامل نہ ہوگا۔

ایک اسٹیج پر جب محترم جناب اعجاز الحق نئے نئے وزیر مذہبی امور بنے تو یہ خیال ہوا کہ اعجاز الحق ایک بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ان کے والد نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔میں نے ان کے دروازے بھی کھٹکھٹائے۔میں نے ان کو چار خط لکھے، درجنوں ٹیلی فون کئے کہ ملاقات کا وقت دے دیں، ممکن ہے ان کو اندازہ ہو نہ ہوا کہ میں کیا بات کرنا چاہتا ہوں۔شاید وقت نہیں ہوگا، یا مصروف ہوں گے۔ بہ ہر حال میری ملاقات نہیں ہو سکی، اور وہ جو مرحلہ تھا جس میں ملاقات ضروری تھی وہ گزر گیا۔یہ وہ وقت تھا جب پچھلے سے پچھلے سال بجٹ کے موقع پر ان معاملات پر بحث ہو سکتی تھی۔ بجٹ کے موقع پر ایک فائنانس بل آتا ہے، حکومت پاکستان جب بجٹ اسمبلی میں لاتی ہے تو ایک فائنانس بل کے تحت لاتی ہے۔ فائنانس بل کی دفعات بڑی مؤثر ہوتی ہیں، ان کی حیثیت ایک بڑے طاقت ور قانون کی ہوتی ہے۔اس فنانس بل کے ذریعے بہت سے قوانین میں ترمیم کردی جاتی ہے۔لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا، لوگ سمجھتے ہیں کہ بجٹ آیا ہے، اعداد و شمار میں پڑ جاتے ہیں کہ تنخواہ کتنی بڑھی، پٹرول کتنا مہنگا ہوا۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ اس فائنانس بل کے ذریعے ترامیم کون کون سی اور کس کس قانون میں ہوئی ہیں۔

ہم نے یہ چاہا تھا کہ اس موقع پر بینکنگ آرڈیننس اور کمپنیز آرڈیننس میں دو تین اہم ترامیم کرائی جائیں ان ترامیم کے لئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر ڈاکٹر عشرت حسین صاحب تیار تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ان قوانین میں یہ ترامیم آنی چاہئیں۔اگر یہ مجوزہ ترامیم آجائیں تو بینکوں کو درپیش کئی اہم رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ ترامیم کابینہ میں زیر بحث آئیں تو میں کابینہ کے اجلاس میں ان کی پوری تائید کروں گا۔ انہوں نے اپنے طور پر بھی وزیر خزانہ کو خط لکھا کہ یہ ترامیم آنی چاہئیں۔ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ ترمیم فائنانس بل میں آجائیں تو بڑا مفید ہوگا۔

وزارت مذہبی امور کے آج کل (۲۰۰۴ میں) جو سیکریٹری ہیں، یہ اس وقت بھی تھے، یہ

رہ چکے ہیں جو طویل عرصے بلکہ تقریباً پوری زندگی وزارت خزانہ اور اس کے اداروں میں رہے ہیں، اور اکاؤنٹس سروس کے آدمی ہیں اور فنانس اور اکاؤنٹ کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کو بھی میں نے خط لکھا کہ آپ اس معاملے میں ایک تجویز کابینہ کے لیے بھجوا دیں۔ اگر یہ تجویز آپ کی طرف سے جائے گی اور وزارت خزانہ کی طرف سے اس کی تائید بھی ہو جائے گی، گورنر اسٹیٹ بینک بھی تائید کریں گے تو ہو سکتا ہے یہ ترمیم منظور ہو جائے۔ یہ ترمیم ہو جائے گی تو اسلامی بینکاری کے بہت سے کام آسان ہو جائیں گے۔ لیکن یہ سب نہیں ہو سکا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ملکی قوانین میں تو کوئی خاص تبدیلی ۲۰۰۱ء کے بعد نہیں ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں کچھ قوانین میں تبدیلی ہوئی تھی جب تک فیصلہ موجود تھا، لیکن وہ جزوی تبدیلی تھی۔ اس پر عملدرآمد کتنا ہو رہا ہے یہ افراد پر منحصر ہے۔ ایک بڑی تبدیلی ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن کے قانون میں ہوئی تھی، وہ میں نے ہی ڈرافٹ کی تھی۔ چوں کہ اس وقت فیصلہ موجود تھا۔ کالعدم نہیں ہوا تھا، اس لئے وہ تبدیلی بھی جاری ہو گئی تھی۔ کیبنٹ نے اسے منظور کر لیا تھا۔ میں نے ہی اس کو کیبنٹ میں پیش کیا تھا۔ اس ترمیم کی رو سے شریعت کے مطابق ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے تمام احکام اور معاملات کو مرتب کیا جانا تھا۔ اس وقت انہوں نے زور و شور سے کام بھی شروع کیا تھا۔

اب کیا کیفیت ہے مجھے نہیں معلوم۔ لیکن بعض لوگ بتاتے ہیں کہ فیصلے پر عملدرآمد نہیں ہو رہا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی قابل ذکر تبدیلی کسی قانون میں نہیں ہوئی، سوائے اسٹیٹ بینک کے اس لیگل فریم کے جو ڈاکٹر عشرت حسین نے جاری کیا تھا۔ اس کے مطابق کچھ اسلامی بینک میدان میں آ رہے ہیں۔ کئی غیر مسلم بینک بھی درخواست دے رہے ہیں۔

چناں چہ ہانگ کانگ شنگھائی بینک بہت بڑا بینک ہے اور پہلے بھی کئی ملکوں میں اسلامی برانچیں قائم کر چکا ہے۔ اس نے پاکستان میں بھی ایک اسلامی برانچ قائم کرنے کے لئے درخواست دی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے ممکن ہے غلط ہو، خدا کرے غلط ہو۔ خدا کرے غلط ہو۔ لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ جو غیر مسلم غیر ملکی بینک اس میدان میں آ رہے ہیں وہ اسلامی بینکنگ کے لئے مسلمانوں سے کہیں زیادہ سیریس و سنجیدہ ہیں وہ ہمارے اپنے بینکوں کے مقابلے میں

اس کاز سے زیادہ مخلص معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے بینک دفع الوقتی کے طور پر لیپا پوتی سے کام چلانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام کا ٹھپہ لگ جائے، باقی کام اسی طرح چلتا رہے۔ اس کے برعکس جو غیر مسلم بینک آرہے ہیں وہ لگتا ہے کہ سنجیدگی سے اس کام کو کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو بڑے دکھ کی بات ہے کہ جو رویہ اس باب میں مسلمانوں کا ہونا چاہیے تھا وہ غیر مسلموں نے اختیار کرلیا ہے۔

اسلامی بینکاری اور اسلامی معاشیات کے مکمل نفاذ کا یہ عمل ایک بھرپور، مسلسل اور مشترک جدوجہد کا متقاضی ہے۔ اس جدوجہد میں تاجر اور کاروباری طبقہ اور علمائے کرام کا گہرا تعاون ناگزیر ہے۔ جب تک علمائے کرام اور اہل افتا اس کام میں تاجروں اور کاروباری حضرات کا مسلسل اور بھرپور ساتھ نہیں دیں گے اس وقت تک اس عمل کی دینی راہ نمائی کا کام نامکمل اور ادھورا رہے گا۔ اسی طرح جب تک خود تاجروں اور کاروباری طبقہ سے اس تبدیلی کا آغاز نہ ہوگا اور جب تک یہ طبقہ علمائے کرام کی راہنمائی اور استفادہ کی ضرورت اور اس پر کلی عمل درآمد کی اہمیت کا احساس نہ کرے گا اس وقت تک یہ کام موثر انداز میں آگے نہ بڑھ سکے گا۔

ارباب حکومت کا کردار اس باب میں جو رہا ہے وہ کسی حد تک ان گزارشات سے آپ کے سامنے آگیا ہوگا، اس لئے محض حکومتی پالیسیاں اور سرکاری قواعد وضوابط بدلوا لینے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک میں اسلامی معیشت کل سے آسکتی ہے اگر آج سارے تاجر اور ارباب صنعت وتجارت یہ طے کرلیں کہ وہ کوئی کام اسلام کے احکام کے خلاف نہیں کریں گے۔ اس کے برعکس اگر تاجروں اور صنعتکاروں کی موثر تعداد یہ طے کیے بیٹھی رہے کہ وہ بہ دستور سودی کاروبار میں ملوث رہے گی، بہ دستور ربا، غرر اور قمار جیسے محرمات کے ارتکاب میں مبتلا رہے گی تو لاکھ قوانین میں تبدیلی ہوتی رہے، یہی سودی نظام جوں کا توں چلتا رہے گا۔

اس عمل میں علمائے کرام کا کردار زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ رائے عامہ علمائے کرام ہی بنائیں گے، تربیت کا فریضہ وہی انجام دیں گے۔ تاجروں کی راہ نمائی کی ذمے داری وہی پوری کریں گے۔ لیکن اس فرض کے لئے ایسے نوجوان، پرجوش، مخلص اور جذبہ عمل سے بھرپور علما کی تیاری ناگزیر ہے جو اس ذمے داری کو اٹھا سکیں، جو فقہ اسلامی کے احکام اور اجتہادات

اور شریعت کے قواعد وضوابط کو آج کے محاورے میں بیان کرسکیں اور ان کو آج کے تجارتی اور مالیاتی مسائل سے مربوط بھی کرسکیں۔

اس کام کے لئے اگر پاکستان کے چند بڑے بڑے دینی ادارے آگے بڑھیں اور یہ کام شروع کردیں تو دس سال کے اندر اندر تبدیلی کے اثرات واضح طور پر سامنے آنا شروع ہوجائیں گے۔اس ضمن میں ایسے مدارس کو درج ذیل کام فوری طور پر کرنا ہوں گے۔

وہ بڑے بڑے دینی مدارس جو اس ذمے داری کو انجام دینے کا فیصلہ کریں وہ اپنے فقہی نصاب میں توسیع کر کے بعض نئے مضامین اور کتابوں کا اضافہ کریں۔ اسلامی معیشت پر دو ایک بنیادی کتب مثلاً کتاب الخراج از امام ابو یوسف اور کتاب الاموال از امام ابوعبید کا اضافہ کریں۔ جدید اسلامی معیشت پر دو تین اچھی کتابیں (مثلاً دکتور وہبہ زحیلی زحیلی کی المعاملات المالیہ المعاصرۃ، سعودی عالم شیخ عمر بن عبدالعزیز المترک کی الربا والمعاملات المصرفیہ وغیرہ) نصاب میں شامل کریں۔ فقہ کے اعلیٰ طلبہ کے لئے جدید معیشت وتجارت پر محاضرات کا اہتمام کرائیں۔ممکن ہوتو ان طلبہ کو ایک ایک کورس بی اے کی سطح کی معاشیات اور تجارت (کامرس) بھی پڑھایا جائے۔

۲۔وہ نوجوان علما جو فقہ اور افتا میں تخصص کر چکے ہوں اور اب افتا کی ذمے داری انجام دے رہے ہوں ان کو مختصر دورانئے (مثلاً دس ہفتے یا سولہ ہفتے) پر مشتمل ایسے کورس کرائے جائیں جو بنیادی معاشیات، پاکستان کے معاشی مسائل، بینکاری اور بین الاقوامی تجارت کے موضوعات کے خصوصی مطالعے پر مبنی ہوں۔

۳۔جن اداروں کے وسائل اجازت دیں وہ اپنے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے فقہ المعاملات میں تخصص کا ایک ۲۔۳ سالہ نصاب شروع کریں۔اس نصاب میں وہ سارا بنیادی ذخیرہ شامل ہو جو اسلامی معیشت، اسلامی بینکاری اور تکافل کے موضوعات پر گزشتہ تیس چالیس سال میں تیار ہوا ہے۔یہ طلبہ نصاب کی تکمیلی شرط کے طور پر ایک ایک تحقیقی مقالہ بھی تیار کریں۔مناسب یہ ہوگا کہ یہ تحقیقی مقالات اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور ممکن ہوتو انگریزی میں بھی لکھائے جائیں۔

۴۔کامرس، معاشیات اور بزنس ایڈمنسٹریشن کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے ایسے تین

چار سالہ کورس کا آغاز کیا جائے جس کا مقصد ان شعبوں کے نوجوان ماہرین کو فقہ المعاملات کے لئے تیار کرنا ہو، اس کورس کا مقصد ان حضرات کو فقیہ، مفتی یا مجتہد بنانا نہیں، بلکہ اچھا مسلمان بینکر، اچھا مسلمان معیشت داں اور اچھا مسلمان منتظم بنانا ہونا چاہئے۔

۵۔ بڑے بڑے شہروں میں واقع بڑے بڑے مدارس ہر مہینے ایک بار ایسے کسی اجتماع کا انعقاد کریں جس میں شہر کے نامور تاجروں، بینکاروں اور کاروباری حضرات کے علاوہ معاشیات و مالیات کے شعبوں سے وابستہ دوسرے لوگوں کو دعوت دی جائے، جہاں ان کے موضوع سے متعلق کسی پہلو پر اصحاب علم ان سے خطاب کریں اور ان کے سوالات کا جواب دیں۔ پھر حسب موقع چائے یا کھانے پر یہ تقریب ختم ہو جائے۔

۶۔ جو علمائے کرام یا جو دینی ادارے مطبوعات کا پروگرام بھی چلا رہے ہیں وہ اسلامی معیشت وتجارت کے موضوعات کو بھی اپنی ترجیحی فہرست میں شامل کریں۔ نئی تصانیف اور طلبہ کے اچھے منتخب مقالات کے ساتھ ساتھ عربی سے اچھی علمی کتابوں کے اردو اور انگریزی تراجم کی اشاعت کا باقاعدہ منصوبہ بنایا جائے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلامی معیشت کے احیا کا یہ کام طویل وقت، مسلسل محنت، مشترکہ کوشش اور ہمہ گیر تعاون کا متقاضی ہے۔ اصل مسئلہ رائے عامہ کی تیاری، بااثر لوگوں کی ذہن سازی اور درپیش مشکلات کے قابل عمل حل کی تلاش اور اس کی نشر واشاعت ہے۔ اسلام کے احکام کی بنیاد پر معیشت وتجارت کی تعمیر نو کا یہ کام سب سے پہلے اہل علم کی ذمے داری ہے۔ وہ آگے بڑھیں گے تو بات آگے بڑھے گی۔ اس وقت اس کام کے لئے فضا جتنی سازگار ہے آج سے دس پندرہ سال قبل اتنی سازگار نہیں تھی۔ اب دیکھیں کتنے مدارس اور جامعات اس کام کے لئے آگے بڑھتے ہیں:

گوئے توفیق وکرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آرد سواراں راچہ شد

Scanned by CamScanner